وَالعَصر

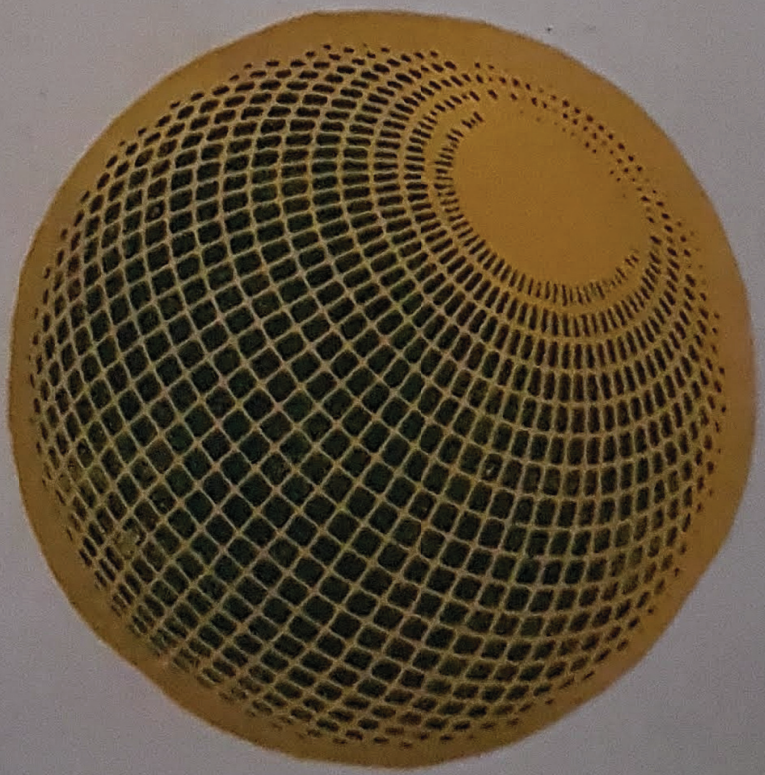

از ـــــ سیّد مسعود مصطفیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالعَصْرِ

گواہی کے کچھ اہم پہلو

از:
سید مسعود مصطفیٰ

(قومِ مہدویہ کے لئے)

نوٹ

برائے ایصال ثواب بحق

والد بزرگوار

حضرت سید شہاب الدین مصطفیٰ

صاحب قبلہؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

زیرِنظر مضمون کوئی تفسیر نہیں ہے بلکہ ''سورۃ والعصر'' میں اللہ تعالیٰ نے والعصر سے جو گواہی دی ہے صرف اسی کے کچھ اہم پہلوؤں پر حسبِ توفیق واستطاعت سائنٹیفک انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے' اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں غور وخوص کی ہدایت دی ہے۔ اسی غور وخوص کے دوران جو باتیں سطح ادارک پر اُبھر آئیں وہی صفحہ قرطاس پر اُبھری ہیں۔ قارئین کرام جیسے جیسے متن پر آگے بڑھتے جائیں گے انہیں ''العصر'' کی گواہی پر گنجینہ اسرار ہونے کا یقین ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ناچیز اس بات پر کامل یقین رکھتا ہے کہ قوم مہدویہ کے صاحبِ بصیرت حضرات' فیضِ مہدیؑ کے صدقہ سے اس گواہی کے مزید اسرار کا علم ضرور رکھتے ہیں۔ بات اتنی ہی ہے ہم ایسی ہستیوں سے دور رہتے ہیں۔ لہٰذا العصر کی گواہی کے مکمل اسرار ہم نہیں جان پائے ہیں۔

قارئین کرام یہ بھی محسوس فرمائیں گے کہ مذہبِ مہدویت' سورۃ والعصر کی گواہی کے عین موافق ہے یعنی ہمارا موقف قرآن اور احادیث سے حق ثابت ہے۔ ناچیز کو قوی توقع ہے کہ قوم کے اور بھی صاحب علم وفضل حضرات اس گواہی کے بارے میں مزید علم سے اپنی قوم کو نوازیں گے۔

بارِدوم میں کچھ اضافہ کیا گیا ہے تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکے

فقط احقر
سید مسعود مصطفیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ بارِ دوم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے کہ تمام تعریف اسی کے لئے ہے' وہ جو کہ اللہ ہے' رب العالمین ہے' وہ جو کہ اتنا رحمٰن ہے کہ ہر شئے کی زندگی یا تحریکِ عمل کے امور کیلئے سارے انتظامات از خود اور بغیر مانگے کر دیتا ہے' وہ جو کہ اتنا رحیم ہے کہ ہر شئے کی زندگی یا تحریکِ عمل کے لئے حالات کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً موزونیت و آسانیاں فراہم کرتا ہے ۔ دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے ۔ لہٰذا میرے لئے وہ اتنا رحمٰن ہے کہ میری پیدائش اِک مسلمان اور مہدوی گھرانہ میں مقدر ہوگئی ۔ یعنی بغیر مانگی کے اور بغیر کوشش کے مجھے ایمان اور تصدیق کی نعمت از خود مل گئی ۔ (یوں تو رحمٰنیت کے ان گنت امور ہیں لیکن ناچیز کو یہ دو امور کی یعنی ایمان اور تصدیق کی نعمت سب سے اہم ہے اسلئے اسی کے بیان پر اکتفا کیا ہے) میرے لئے وہ اتنا رحیم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صدقہ سے دورِ یتیمی میں میرے سر پر ہاتھ رکھا' مجھے علم کی خواہش ہوئی تو اللہ نے مجھے اسی صدقہ سے علم کی روشنی سے نوازا اور پھر اُسی صدقہ سے مجھے غنی بھی بنا دیا ۔ اے اللہ تو ہی میرے ہر عمل کے اسلام' ایمان اور احسان کی توفیق کے لئے وقتِ تحریر کا مالک ہے ۔ اے اللہ میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تیری ہی سعی کرتا ہوں (اسلئے کہ میں تیرا ہوں) اس لئے ہر عمل کے اسلام ایمان اور احسان کی توفیق کچھ اس طرح کر دے کہ میں تیرے انعام یافتہ ہستوں کی اتباع کر سکوں تا کہ مجھ سے غلطی نہ سرزد ہو اور چونکہ تو ہی وقتِ تحریر کا مالک ہے اسلئے میں ڈرتا ہوں کہ مجھ سے غلطی نہ ہو جائے اور میں مغضوب نہ ہو جاوں ۔ اور تو میری توفیق چھین نہ لے ۔ تو مالکِ توفیق ہے اگر دے سکتا ہے تو چھین بھی سکتا ہے ۔ جب توفیقِ اسلام ایمان اور احسان چھین لی جاتی ہے تو انسان ہر طرح ضال میں آجاتا ہے اے مالکِ توفیق اِس حال سے ہمیشہ بچائے رکھ ۔

لہٰذا اب جبکہ میں اس سطح قرطاس پر کچھ اضافہ کے ساتھ جو نقوش ابھار رہا ہوں تو مجھے ایسی توفیق دے کہ میری تحریر میں اسلام کی سلامتی ہو' تحریر کی سچائی پر حق کی طرح یقین ہو اور احسانِ تحریر یعنی حقیقت کو پہنچنے کی سعی خالص و کامل ہو اور اے میرے اللہ مجھے اس تحریر میں غلطیوں سے بچا کہ میں توفیق سے محروم نہ ہو جاوں ۔ آمین **فقط احقر سید مسعود مصطفیٰ**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْعَصْرِ ۝

زمانے کی قسم

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝

بے شک انسان خسارہ میں ہے

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰت

سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝

اور وصیت کئے حق کے ساتھ

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

اور وصیت کئے صبر کے ساتھ

''**سورۃ والعصر**'' ترتیب نزول کے لحاظ سے بالکل ابتدائی دور کی ہے' حضور سرور کائنات رسول اللہ ﷺ پر مکہ معظّمہ میں نازل ہوئی۔

اگرچیکہ یہ سورۃ بہت چھوٹی اور سادہ زبان میں ہے لیکن اس کی جامعیت کی وجہ سے حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اگر قرآن میں اس سورۃ کے سوائے کچھ اور نازل نہ ہوا ہوتا تو یہی ایک سورۃ لوگوں کی ہدایت کے لئے کافی ہوتی۔ یہی نہیں روایات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ صحابۂ کرام جب ایک دوسرے سے ملتے تو جدا ہوتے وقت یہ سورۃ ضرور سناتے۔

اس سورۃ کی جامعیت کو والعصر کی شروعات سے اور بھی بڑھا دیا گیا ہے۔ والعصر یعنی قسم ہے زمانے کی۔ لہٰذا یہ سورۃ قسم سے شروع ہو رہی ہے۔ اس لئے یہ غور کرنا ضروری ہے کہ اللہ نے قسم کیوں کھائی' اس کی نوعیت کیا ہے اور باقی متن پر اس کا کیا بار ہے۔

کلام پاک میں اللہ کی قسمیں:

دیکھا گیا ہے کہ اپنے کلام میں اللہ نے کچھ پیام دینے سے پہلے کئی موقعوں پر اپنی ہی مختلف تخلیقات کی قسمیں کھائی ہیں۔ ان قسموں کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے صفات کی شہادت دی ہے اور اسی طرح سے بار بار اپنی قدرت کو سمجھایا ہے۔

ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ جن چیزوں کی قسمیں کھائی جا رہی ہیں یا جس قدرت کا گواہ مقرر کیا جا رہا ہے یا جس تمثیل سے اپنی قدرت کی گواہی دی جا رہی ہے' اسی نوعیت کی قدرت کا اظہار اور اطلاق آگے کے متن پر کیا گیا ہے۔

ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ جن چیزوں کی قسمیں کھائی جا رہی ہیں اور جن خصوصیات کی شہادت مقصود ہے وہ آفاقی نوعیت کی ہیں۔ یعنی ہر جگہ اور ہر وقت کے لئے صحیح ہیں۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اقطاعِ عالم میں قدرت کا ایک ہی مفہوم ہمیشہ کے لئے قائم رہے اور اس کا اطلاق اور اس کی تاویل ہر جگہ اور ہر وقت ایک ہی ہو۔

جہاں جہاں بھی قسم کھائی جارہی ہے اس قسم کے فوری بعد جس چیز یا امر کے لئے قسم کھائی جارہی ہے' یا جس قدرت کی شہادت دوسری چیز میں مقصود ہے' اس کا بیان ہے اور پھر اس ضمن میں احکام وہدایات ہیں۔

اللہ کی قدرت میں یہ بات ضرور اور یقیناً ہے کہ وہ اپنی بات بغیر کسی قسم کے سمجھا دے۔ لیکن قسم کھا کر اللہ تعالیٰ یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ کیا تم نے ''اس قدرت'' کو ''اس امر'' میں نہیں دیکھا۔ بالکل اسی طرح ''اس قدرت'' کا استعمال ''یہاں'' بھی ہوا ہے۔ یعنی انسان کے ایک پہلے سے حاصل شدہ تجربہ کا استعمال کرتے ہوئے اِسی انسان کو اِسی قسم کے دوسرے تجربہ کے بارے میں علم دیا جارہا ہے جس کا علم اس کو پہلے نہیں تھا۔ تعلیم کا یہ طریقہ اصول ارتباط (Principle of Association) پر مبنی ہے اور تلازم خیال رکھتا ہے۔ نفسیاتی طور پر یہ طریقہ بالکل صحیح اور موثر ہے۔

سورہ والعصر میں زمانہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ یعنی زمانہ کی (وقت کی) خصوصیات جو کہ آفاقی ہیں' سے شہادت مقصود ہے۔ اصولِ ارتباط کے تحت' چنانچہ' اس کی خصوصیت کا اطلاق سورۃ کے متن پر ہوگا۔ اس کی تفصیل آگے ملاحظہ کے لئے پیش کی جارہی ہے۔

نظریۂ وقت:۔ نظریۂ وقت تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام سے مروج ہے۔ ابتداء میں یہ نظریہ دن کی حالت اور رات کی حالت میں اس کی تبدیلی کے تجربہ سے انسان کی شعوری سطح پر نمودار ہوا۔ بعد میں انسانی جستجو اور تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ کرۂ ارض مسلسل گردش میں ہے۔ اس کی حرکت ایک خاص زاویہ سے اپنے محور پر محیط ہے۔ اسی حرکت کی وجہ سے زمین کے وہ حصے جو سورج کے سامنے ہیں وہاں دن کی حالت ہوتی ہے۔ اور وہ حصے جو پیچھے ہیں وہاں سورج کی روشنی نہ پہنچنے سے رات کی حالت ہوتی ہے۔ پھر اِسی حرکت کی وجہ سے وہ حصے جو سورج کے رخ پر ہیں وہ پیچھے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ حصے جو پیچھے ہیں وہ سورج کے رخ پر آجاتے ہیں۔ اسی طرح دن کی رات میں تبدیلی اور رات کی دن میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی مسلسل اور مدوّر (CYCLIC) ہے

چونکہ ایک دن اور ایک رات کا وقوع' کرہ ارض کے تسلسلِ حرکت کے تاثر کا بنیادی واقعہ ہے۔اس لئے ایک دن اور ایک رات کا وقفہ زمانہ یا وقت کی اکائی ہونا چاہئے۔

لیکن یہ زمین چونکہ ایک کرّہ ہے ' اس کا درمیانی حصہ سطح پیمانہ (VERTILINEAR-SCALE) کے لحاظ سے زیادہ وسیع اور اُبھرا ہوا ہے جو بتدریج اوپر اور نیچے کی جانب گھٹتا ہوا قطبین کی تشکیل کرتا ہے۔

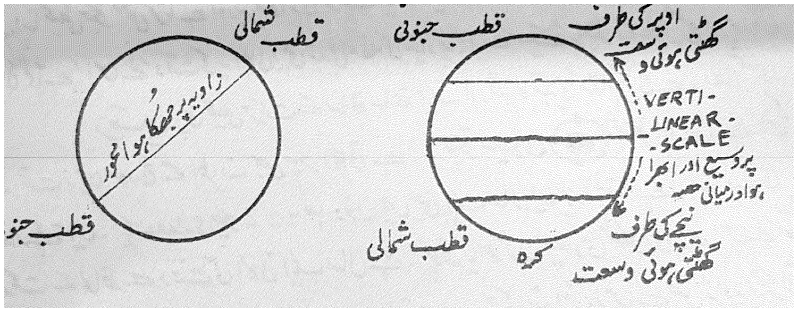

اور چونکہ یہ کرہ اپنے محور کے ساتھ ایک جانب جھکا ہوا ہے' اس لئے سورج کی روشنی مختلف جگہوں پر مختلف وقفہ رکھتی ہے۔ چنانچہ مختلف جگہوں پر دن اور رات کی حالت مختلف ہوتی ہے۔کہیں دن طویل ہے تو کہیں رات طویل ہے' یہاں تک کہ قطبین میں مہینوں طویل راتیں اور مہینوں طویل دن ہوتے ہیں۔اسی لئے پوری دنیا کے لئے وقت کی ایک معیاری اکائی (STANDARD UNIT) کے طور پر ایک دن اور ایک رات کی بنیاد موزوں نہیں' یہی وجہ ہے کہ تبدیلی حالت کی بنیاد کی بجائے تبدیلیٔ مقام کی بنیاد کو تعینِ وقت اور تعینِ اکائی وقت کیلئے اپنایا گیا۔

زمین کی گردش (تبدیلیٔ مقامِ محوری) اپنے محور پر محیط ہے۔یعنی ایک نقطہ یا ایک مقام محوری گردش کرتے ہوئے پھر اُسی مقام پر آجاتا ہے جہاں سے نکلا تھا۔یعنی ایک چکر مکمل ہوتا ہے' اسی طرح 360° ڈگری زاویہ کی حرکت مکمل ہوتی ہے۔ان 360° درجوں کی حرکت کے لئے درکار

وقت کے وقفہ کو 24 برابر حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔اور ہر حصہ ایک گھنٹہ کہلاتا ہے۔یعنی زمین کی ہر 15 ڈگری کی محیطی حرکت ایک گھنٹہ میں مکمل ہوتی ہے۔زندگی کے مختلف امور کیلئے ایک گھنٹہ کا وقفہ یا پیمانہ بہت زیادہ وسیع ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ وقت کی اکائی ایسی ہو کہ چھوٹی چھوٹی حرکت کو بھی ناپ سکے۔اس لئے ان 24 حصوں کے ہر حصہ کو مزید 60 برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا۔اور ہر حصہ ایک منٹ کہلایا گیا۔اسی طرح زمین کی (0.25) ڈگری کی محیطی حرکت ایک منٹ کے وقفہ میں مکمل ہوتی ہے۔ بہت سی چیزوں کی حرکت اتنی تیز ہوتی ہے کہ اُسے ایک منٹ کے پیمانہ سے نہیں ناپا جاسکتا۔اس لئے ان 60 حصوں کے ہر حصہ کو مزید 60 برابر حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور ہر حصہ کو ایک سکنڈ کہا گیا ہے۔اسی طرح زمین کی ۰۰۴۱۶۶۶ء (0.0041666°) ڈگری کی محیطی حرکت ایک سیکنڈ کے وقفہ میں مکمل ہوتی ہے۔اسی حرکت یعنی تبدیلیٔ مقام کے وقفہ (ایک سیکنڈ) کو وقت کی اکائی مقرر کیا گیا۔چونکہ زمین کا ہر حصہ ایک ہی وقت میں اپنا محیطی چکر مکمل کرتا ہے اور ہر مقام کی حرکت ایک سیکنڈ کے وقفہ میں اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ اوپر بتلائی گئی ہے۔اس لئے وقت کی یہ اکائی یعنی تبدیلیٔ مقام کی بنیاد پر ایک سیکنڈ ہر جگہ کے لئے صحیح اور موزوں ہے۔

زمین اپنی محیطی حرکت کے ساتھ ساتھ ایک اور قسم کا تبدیلیٔ مقام کرتی ہے۔نظام شمسی کے تحت زمین سورج کے اطراف بھی چکر لگاتی ہے۔یہ چکر بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔اس کو مدار کہتے ہیں۔ایک مداری چکر 365.1/4 دنوں میں یعنی ایک سال میں پورا ہوتا ہے۔لہٰذا مداری حرکت کے لحاظ سے وقت کی اکائی ایک سال ہے۔چونکہ یہ حرکت بیضوی شکل کی ہے اس لئے سورج سے زمین کا فاصلہ تبدیل ہوتے رہتا ہے۔اور ساتھ ہی سورج کی شعائیں زمین سے جس زاویہ پر ٹکراتی ہیں.....(زاویہ وقوع ANGLE OF INCIDENCE) وہ بھی مسلسل تبدیل ہوتے رہتا ہے۔اس لئے زمین پر کسی بھی مقام پر ہمیشہ دن اور رات کی حالت بدلتے رہتی ہے۔اس طرح کہ ایک مداری چکر کے دوران کسی بھی مقام پر دن اور رات کی ایک کیفیت ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے' دوبارہ نہیں ہوتی۔آسان بات یہ ہے کہ جو حالت گذر گئی وہ لوٹ کر نہیں آتی۔

نوٹ:۔انسان چونکہ صرف زمین پر بستے ہیں اور یہ سورۃ انسان کیلئے ہی نازل ہوئی ہے اسلئے زمینی وقت کے بارے میں ہی بیان کیا گیا ہے کسی اور سیارہ یا سیارگان کے وقت سے اس سورۃ کا تعلق نہیں اور نہ اس کا ذکر ضروری ہے

وقت کی اہم خصوصیات:

(1) وقت تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام کا تاثر اور تقاضہ ہے۔(اوپر بتایا جاچکا ہے)

(2) وقت میں تسلسل ہے یعنی ایک CONTINUOUS VARIABLE ہے۔

(3) وقت ایک بے لوث یعنی بالکلیہ خالص (PURE) حقیقت ہے اس کو کسی اور چیز سے ملوث (MIXED/POLLUTE) نہیں کیا جاسکتا۔

(4) وقت چونکہ تسلسلی نظریہ ہے اس لئے اس کی ابتداء سے انتہا تک اس کا اصل وقفہ (ABSOLUTE RANGE) ہے۔

(5) وقت کو صرف چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بانٹا جاسکتا ہے' ان اکائیوں کو علٰحدہ علٰحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

(6) وقت کی رفتار (معیارِحرکت) ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی ہوتی ہے' کہیں زیادہ اور کہیں کم نہیں ہوتی۔ کیونکہ دنیا کا ہر مقام 24 گھنٹوں میں اپنی محوری گردش پوری کرلیتا ہے۔اور بیک وقت کرتا ہے۔ اس لئے کبھی اور کہیں یہ گردش 24 گھنٹوں کے بجائے 23 گھنٹوں میں یا 25 گھنٹوں میں پوری نہیں ہوتی۔اس گردش کیلئے ۲۴ گھنٹے ہی ہر جگہ کے لئے متعین ہیں۔

(7) چونکہ وقت کا تعین زمین کی محیطی حرکت (محوری گردش) سے عین تعلق رکھتا ہے اس لئے جب گردش زمین کی رفتار ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی ہے تو رفتار وقت کا بھی ایک ہی ہونا ضروری ہے۔ یعنی وقت کی رفتار (معیارِحرکت) بھی ہمیشہ ایک ہی ہے۔کبھی زیادہ کبھی کم نہیں ہوسکتی۔

نوٹ: سائنسی زبان میں رفتار کو معیارِحرکت کہتے ہیں۔

(8) وقت جو گذر چکا پھر لوٹ کر نہیں آتا۔وقت چونکہ تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام کا تاثر اور

تقاضہ ہے اور زمین کی مداری گردش کے دوران دن اور رات کی ایک حالت صرف ایک مرتبہ ہی ہوتی ہے اور لوٹ کر نہیں آتی اس لئے وقت بھی لوٹ کر نہیں آتا۔

(9) وقت کا ربط تمام موجودات سے ہے، چونکہ تمام موجودات حالتِ حرکت میں ہیں یعنی سب ہی موجودات کے لئے تبدیلیٔ حالت اور تبدیلی مقام ایک حقیقت ہے۔ کہنے کو تو اس زمین پر بڑے بڑے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں لیکن زمین کے ساتھ یہ بھی محوری گردش اور مداری گردش میں ہیں۔ ان میں طبعی اور کیمیائی حالتوں کی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ لہٰذا تمام موجودات کے لئے تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام ایک حقیقت ہے اسی لئے وقت کا تعلق تمام موجودات سے ہے۔

(10) وقت چونکہ متحرک ہے اس لئے ہر متحرک شئے کی طرح اس کی بھی تین حالتیں ہیں۔ گذری ہوئی، موجودہ اور آنے والی، یعنی ماضی، حال اور مستقبل

انسان اور وقت:

دنیا میں انسان کے لئے وقت کا اطلاق اس کے واقعۂ پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور واقعہ موت تک رہتا ہے۔ یعنی وقت انسان کی پوری زندگی سے منسوب ہے۔ انسان کے لئے بھی دوسرے تمام موجودات کی طرح تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام ایک حقیقت ہے۔ اس لئے وقت کے ساتھ انسان کا رشتہ ضروری امر ہے۔ چنانچہ وقت کی دو اکائیاں، انسان کی زندگی کی ایک اکائی کے برابر ہے۔ انسان کی زندگی کی علامت اس کی سانس سے ہے۔ لہٰذا ایک سانس ایک مرتبہ ہوا کا اندر لینا (INHALATION) اور ایک مرتبہ ہوا کا خارج کرنا (EXHALATION) زندگی کی ایک اکائی ہے۔ معمول کی حالت میں ہوا اندر لینے کے لئے تقریباً ایک سیکنڈ اور ہوا چھوڑنے کے لئے تقریباً ایک سیکنڈ کا وقت لگتا ہے۔ لہٰذا وقت کی دو اکائیاں زندگی کی ایک اکائی کے برابر ہے۔ جس طرح گذرا ہوا سیکنڈ واپس نہیں آتا اور ہر آنے والا سیکنڈ نیا ہوتا ہے، اسی طرح ہر گزری ہوئی سانس لوٹکر نہیں آتی اور ہر آنے والی سانس نئی ہوتی ہے۔ جس طرح وقت کی تین حالتیں ہیں اسی طرح انسان کی بھی تین حالتیں ہیں۔ بچپن، جوانی، بوڑھاپا۔

خسران:

خسران یا خسارہ کا مطلب ہے نقصان۔ نفع یا نقصان کسی بھی معاملت (TRANSACTION/BUSINESS) کا نتیجہ ہے۔ معاملت میں لاگت (COST OF INPUTS OR PRINCIPAL) ہوتی ہے اور اس کے استعمال سے (PROCESSING) سے جو چیز حاصل ہوتی ہے (OUTPUTS) اس کی قیمت کے لحاظ سے نفع یا نقصان منتج ہوتا ہے۔ یا کسی چیز کی قیمتِ خرید اور قیمتِ فروخت کے فرق سے نفع یا نقصان محسوب ہوتا ہے۔ جب کسی چیز کی متوقعہ یا کسی معیار پر مقررہ اور متعینہ قیمت وصول نہ ہو تو نقصان یعنی خسارہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کام ایک گھنٹہ کا ہے اور اس کی مقررہ اجرت دس روپئے ہے۔ اگر کسی شخص کو اس کام کی تکمیل پر نو روپئے ملتے ہیں تو وہ نقصان میں ہے۔ اور اگر کسی اور شخص کے کام سے خوش ہو کر اس کا مالک دس روپئے کے بجائے گیارہ روپئے دیتا ہے تو وہ فائدے میں رہتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ شخص جسے نو روپئے ملے نقصان میں کیوں ہے۔ فرض کیجئے کام کے مقررہ معیار کے لحاظ سے کام ہوا ہے تو بیشک یہ شخص نقصان میں ہے۔ لیکن اگر کام کے مقررہ معیار پر کام نہیں ہوا ہو تو پھر یہ شخص نقصان میں نہیں کیونکہ اس کو اس کے کام کے لحاظ سے اجرت مل گئی۔ معاملت کا یہ نقطہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

ایمان:

کہا جاتا ہے کہ ''ایمان'' کا لفظ ''آمن'' سے نکلا ہے۔ امن یعنی سکون بخشنا یا امن دینا۔ اور ''ل'' یا ''ب'' کے صلوں کے ساتھ اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ تصدیق کرنا' اعتماد کرنا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کو ایمان کی کیوں ضرورت ہے۔ اکثر توضیحات اس قسم کی ہیں کہ انسان ایک حالتِ بے چینی میں ہے۔ انسان اپنی حقیقت جاننا چاہتا ہے۔ اپنے پیدا کرنے والے کے متعلق جاننا چاہتا ہے۔ اپنی زندگی کے لئے فکر مند رہتا ہے۔ اپنے حال اور مستقبل کیلئے پریشان رہتا ہے۔ اسے ہمیشہ ناموافق حالات کا ڈر لگا ہوا رہتا ہے۔ لہٰذا ان تمام امور میں اپنے لئے

اطمینان حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔اور یہ اطمینان اُسے جب ہی حاصل ہوتا ہے جب کہ اُسے تمام اندیشوں کے خلاف احساسِ تحفظ مہیا رہے۔

کشمکشِ حیات کے محرکات کے بارے میں سائنٹفک تجربات اور تحقیق کے بعد نفسیاتی بنیادوں پر ان محرکات کی حسبِ ذیل زمرہ بندی کی گئی ہے۔

(1) تحفظ کی خواہش: انسان معاشی' سماجی' نفسیاتی اور روحانی تحفظ چاہتا ہے۔انسان اپنے طبعی وجود' غذا' لباس اور مکان کے لئے تحفظ چاہتا ہے۔انسانی جماعت میں اپنے وجود کا تحفظ چاہتا ہے۔اپنے حال اور مستقبل کے تحفظ کے لئے بہتر سے بہتر طور پر مالیہ اور وسائل کی فراہمی چاہتا ہے اور مستقبل کے لئے حاصل کردہ وسائل کا تحفظ چاہتا ہے۔ اپنی روحانی بقا بھی چاہتا ہے دنیا میں تقریباً ہر انسان آخرت بالخیر چاہتا ہے۔

(2) چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش: احساسِ لگاوٹ انسان کو پیدا ہوتے ہی اپنی ماں سے ملتا ہے اور رفتہ رفتہ باپ اور دوسرے متعلقین اس احساس میں شامل ہو جاتے ہیں۔اسی طرح سماجی زندگی میں بھی انسان اسی خواہش کے تحت دوست واحباب بناتا ہے۔

(3) اپنی ذات کی پہچان کی خواہش: انسان چاہتا ہے کہ لوگ اس کی شخصیت کو سمجھیں اس کی انفرادیت کو مانیں اور اس کو اپنے درمیان جگہ دیں۔

(4) نئے تجربات کی خواہش: انسانی تجسس ایک فطری واقعہ ہے۔معاشی' سماجی' نفسیاتی اور روحانی ارتقاء کے لئے ماحول کی تبدیلی کرتا رہتا ہے۔اور ہر تبدیلی ایک نیا تجربہ فراہم کرتی ہے۔ معاشی ارتقاء کے لئے کاروبار اور کاروباری طریقے بدلتے رہتا ہے' اسی طرح سماجی ارتقاء کے لئے نئے نئے دوست واحباب اور نئی نئی پارٹیوں سے منسلک ہوتا رہتا ہے۔نفسیاتی طور پر انہی ذرائع اور ماحول سے نئے نئے اندازِ فکر اور عمل اپناتا ہے۔اپنی خواہش کے جس درجہ سے گذر رہا ہے اُسی درجہ کے متعلقہ ماحول اور صحبت میں رہتا ہے۔(ماخوذ بہ ولسن اور گیالپ' ڈاکٹر اِرونگ لارگی' ماسلو' نفسیاتی ماہرین)

مندرجہ بالا محرکات سے پتہ چلتا ہے کہ ''تحفظ'' کو پہلا مقام حاصل ہے۔ یوں تو چاروں زمروں میں بھی تحفظ کا عنصر کسی نہ کسی طرح کام کر رہا ہے۔ لہٰذا انسان تحفظ چاہتا ہے۔ اور تحفظ دینے والے کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس کے لئے وہ اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے اور اپنے سے زیادہ ماہر عمل کے پاس طمانیت حاصل کرنے کی توقع رکھتا ہے۔ اس کی بہترین مثال ہے انسان اپنی زندگی کے تحفظ کے لئے کسی طبیب یا ڈاکٹر سے رجوع ہوتا ہے' کیونکہ بیماریوں' ان کے وجوہات اور ان کے علاج کے تعلق سے ایک ڈاکٹر کو بہت زیادہ علم رہتا ہے اور وہ اپنے عمل علاج میں زیادہ ماہر بھی رہتا ہے۔ ایک مریض ایک ڈاکٹر سے اس لئے رجوع ہوتا ہے کہ اُسے اس کے علم پر اور عملی مہارت پر اعتبار و اعتماد ہے اور اسی اعتماد کے تحت مریض اپنی زندگی بے چوں و چراں ڈاکٹر کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی ڈاکٹر کی تمام ہدایتوں کو مانتے ہوئے ان پر عمل کرنے کا عہد کرتے ہوئے وہ جب ڈاکٹر کے پاس سے نکلتا ہے تو اُسے یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ اُسے اس کی زندگی کا تحفظ حاصل ہے۔ اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں وہ اپنے تحفظ کے لئے متعلقہ ماہرین پر اعتماد کرتے ہوئے متعلقہ تمام امور ان پر چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن ایک ایسا مرحلہ بھی انسان کے تجربہ میں آتا ہے کہ دنیا میں ایسے ماہرین بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک ڈاکٹر ایسے مرض کے علاج کے لئے اپنی بے بسی ظاہر کر دیتا ہے جو مرض کہ لاعلاج ہو جاتا ہے۔ اور سببِ موت بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ماہرین معاشیات بھی معاشی تحفظ دینے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ ماحولیاتی ماہرین اور جیالوجسٹ زلزلوں' طوفانوں اور قحطوں سے تحفظ دینے سے قاصر نظر آتے ہیں لہٰذا سمجھا جاسکتا ہے کہ ان انسانوں سے بھی زیادہ کہیں زیادہ علم و عمل کا ماہر ضرور موجود ہے۔ اگرچیکہ وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے لیکن اس کا وجود ضرور ہے جو تمام امور کائنات پر مکمل قادر ہے۔ اس وجود کا تصور تو آدمؑ سے اولادِ آدمؑ کو ضرور ملا ہے۔ لیکن وہ کون ہے' کہاں ہے' کیسا ہے کا علم اولاد سے اولاد کو آتے ہوئے معدوم ہو گیا۔ اور پھر وہ اسی کی تلاش میں ہو گیا۔ لاعلمی کا نتیجہ گمراہی ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان اپنے سے زیادہ طاقتور چیزوں اور ناقابل تسخیر موجودات میں اس قادرِ مطلق ہستی کو

نہ صرف تلاش کرنے لگا بلکہ ماننے بھی لگا۔لہٰذا ضروری ہوگیا کہ انسان کی صحیح رہنمائی کی جائے۔اور قادرِ مطلق نے اپنی صحیح نشاندہی کے لئے سلسلۂ ہدایت کا انتظام کردیا۔اب انسان کے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ اس نشاندہی کو سمجھے' مانے' ہدایت پر عمل کرے اور تحفظ پائے۔اسی عمل کا نام ایمان ہے۔یعنی قادرِ مطلق ہستی کو پورے صفات کے ساتھ کاملاً متصف مانتے ہوئے' اس کی ہدایت پر عمل کرنا۔اسی عمل میں مکمل یقین واعتماد ہونا ضروری ہے۔ڈاکٹر کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ایمان کے اجزاء کیا ہیں' رجوع کرنا' اعتمادِ کامل رکھنا' بے چوں وچراں اپنے آپ کو حوالے کرنا' عہد کرنا' ہدایت کو حق ماننا اور ہدایت پر عمل کرنا' یہی ایمان کے اجزاء ہیں۔قرآن شریف کے سورہ بقرہ کے رکوع 10 سے یہی بات سمجھائی گئی ہے۔خاص طور سے یہ بات بتائی گئی ہے کہ ''ایمان'' میں ''عہد' کا جز بے حد اہم ہے۔عہد پر قائم رہنا اور ہدایت پر عمل کرنا ہی ایمان کی سلامتی کا ضامن ہے۔یہ عہد کیا ہے' عہد یہ ہے کہ میں تجھے ہی قادرِ مطلق سمجھتا ہوں' اور تیری صفات میں کسی اور کو شامل نہیں کرتا ہوں' اپنے آپ کو تیرے حوالے کرتا ہوں' یعنی میرا وجود اب میرا نہیں' میں اس پر بے اختیار ہوں اور تیری مرضی ومنشاء پر چھوڑتا ہوں۔تو ہی اس کے اچھے اور بُرے کا مالک ہے۔تو ہی تحفظ دینے والا ہے۔لہٰذا میں تیری ہر ہدایت پر عمل کرتا ہوں (ہدایت کی ترسیل راست ہوسکتی ہے یا بالواسطہ) جب اعتماد اٹوٹ یقین میں ترقی کر جاتا ہے تو انسان خود گواہی دینا شروع کر دیتا ہے۔ ''نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے'' اس حالت میں خود حوالگی' عہد پر قیام اور ہدایت پر عمل کا اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر ہونا ضروری امر ہے۔

مندرجہ بالا متن سے یہ بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ جہاں ایمان کا لفظ ہے وہاں ہدایت' صاحب ہدایت اور ہدایت بردار کا ذکر ہے۔یعنی ان تینوں حقیقتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔یعنی اللہ پر ایمان' اللہ کے کلام پر ایمان اور اللہ کی ہدایت ہم تک پہنچانے والوں پر کامل یقین ہونا اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔

عملِ صالح:۔

عمل صالح وہی عمل ہے جس کی ہدایت ہوتی ہے اور جس سے ''خیر'' پیدا ہو۔ ہدایت ہے صراطِ مستقیم کی اور صراطِ مستقیم صراطِ رسول ہی ہے۔ لہٰذا عملِ رسول کی پوری پوری اتباع ہی عملِ صالح ہے۔ یعنی حدیثِ جبرئیل کے تحت اسلام، ایمان اور احسان سے عمل متصف ہو۔

اتنا جاننے کے بعد اب سورۃ ''**والعصر**'' کی جانب غور فرمائیں۔

وَ الْعَصر یعنی زمانہ کی قسم۔ یا زمانہ کی شہادت! یہ بات پہلے ہی بتائی جا چکی ہے کہ اللہ کی قسموں کا مقصد کیا ہے اور ان کا انطباق سورۃ کے متن پر کیا ہوتا ہے۔ اللہ اپنی ہی قدرت کی گواہی دیتے ہوئے یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس طرح اس کی قدرت کے عوامل ایک ''امر'' میں کارفرما ہیں اسی طرح دوسرے امر میں بھی اسی قدرت کے عوامل کارفرما ہیں۔ لہٰذا وہ ''امر'' جس کی کہ قسم کھائی جا رہی ہے تمثیلاً مظہر ہے۔ اسی لئے اس کے خصوصیات اور مشتملات کا انطباق آگے کے متن پر پورا پورا ہوگا۔

اس سے پہلے کہ آگے بڑھیں ایک اہم بات کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ اکثر تفاسیر میں والعصر کا مفہوم تیزی سے گذر جانے والا زمانہ بتایا گیا ہے۔ لیکن ابتداء میں وقت کی خصوصیات میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ وقت کی رفتار ہر جگہ اور ہمیشہ ایک ہی ہے۔ چونکہ وقت یا زمانہ زمین کی محوری گردش سے منسوب ہے اور زمین کی ان دونوں گردشوں کی رفتار معین اور مقرر ہے۔ اسلئے وقت کی رفتار بھی معین اور مقرر ہے۔ یہ کبھی تیز رفتار یا کبھی سست رفتار نہیں ہوتا۔ البتہ یہ صرف انسان کا ایک احساس ہے۔ طالب علموں کو اکثر امتحان حال میں اس قسم کا تجربہ ہوتا ہے۔ فرض کیجئے تین گھنٹوں کا پرچہ ہے اور چھ سوالات حل کرنا ہے۔ اس لحاظ سے ہر سوال کے لئے آدھا گھنٹہ معین ہے۔ فرض کیجئے پہلا ہی سوال حل کرنے میں ایک طالب علم اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ اُسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس سوال کے لئے معینہ آدھا گھنٹہ ختم ہو چکا اور اب وہ دوسرے سوال کا حق مار رہا ہے۔ جب وہ پہلا سوال ختم کر کے سر اُٹھاتا ہے تو اس پر حقیقت کھلتی ہے کہ اس نے دوسرے سوال کا وقت بھی صرف کر دیا ہے۔ جب وہ کہہ اٹھتا ہے کہ ''وقت اتنا تیزی سے آگے بڑھ گیا!!'' یہ تو صرف ایک احساس ہے حقیقت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ غفلت میں پڑ گیا اور جب

جا گا تو بہت وقت ختم ہو چکا تھا۔ **لہٰذا** العصر میں جو بات بتائی جارہی ہے وہ وقت کی تیزی کے بارے میں نہیں بلکہ ''غفلت'' کے بارے میں ہے۔

وقت کی دو جہتیں ہیں وقتِ مکمل اور وقتِ جاری۔ یعنی وقت مکمل ہوتے ہوئے بھی جاری ہے۔ یعنی (PERFECT CONTINUOUS) ہے۔ وقت کی جو اکائیاں سامنے سے گذر کر پیچھے چلی جارہی ہیں وہ وقتِ مکمل ہے پھر سامنے آنے والا وقت وقتِ جاریہ ہے۔ ان دو جہتوں سے تین حالتیں بنتی ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ اسی لئے وقت کی اساس پر جتنے بھی امور ہیں، جتنے بھی پروگرامس ہیں وہ دو جہتی ہیں۔ قلیل مدتی اور طویل مدتی۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ والعصر میں زمانہ یعنی وقت کی شہادت دیتے ہوئے فرمایا ہے۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ یعنی بے شک انسان نقصان میں ہے۔ شہادت کے قاعدے کی رو سے ''وقت'' کی خصوصیات کا اطلاق اس آیت کے متن پر ہوگا۔ اس آیت میں نقصان کی بات بتائی جارہی ہے۔ وقت کی اساس پر نقصان کی شہادت دی جارہی ہے تو نقصان کی بھی دو جہتیں ہیں، یعنی قلیل مدتی اور طویل مدتی۔

قلیل مدتی نقصان:۔

وقت ایک قدرتی اثاثہ ہے۔ اسی طرح زندگی بھی ایک قدرتی اثاثہ ہے۔ یہ بات پہلے ہی بتائی جا چکی ہے کہ ہر ایک سیکنڈ (وقت کی اقل ترین اکائی) جو کہ گذر چکا وہ پھر لوٹ کر نہیں آتا لہٰذا جو سیکنڈ گذر چکا وہ خرچ ہو چکا، یعنی وقت کے مجموعی اثاثہ میں اتنی کمی آ گئی۔ اثاثہ کی کمی خود ایک نقصان ہے۔ اسی طرح انسان کی زندگی ایک اثاثہ ہے۔ یہ بات پہلے ہی بتائی جا چکی ہے کہ زندگی کی ہر سانس (زندگی کی اقل ترین اکائی) جو گذر چکی وہ لوٹ کر نہیں آتی۔ لہٰذا جو سانس گذر چکی وہ خرچ ہو چکی، یعنی زندگی کے مجموعی اثاثہ میں سے قدر اکائی منہا ہوگئی۔ یہاں بھی اثاثہ کی کمی خود ایک نقصان ہے۔

وقت کی اہم خصوصیات کا اطلاق کرتے ہوئے دیکھا جائے تو حسبِ ذیل باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔

(1) جس طرح وقت تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام کا تاثر اور تقاضہ ہے اس کا نقصان بھی اسی

وجہ سے ہے۔ اگر تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام نہ ہو تو وقت بھی ٹھیر جائے گا۔ یعنی نظریۂ وقت ہی قائم نہ رہے گا۔ بالکل اسی طرح تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام کا تاثر اور تقاضہ زندگی ہے۔ اس کا نقصان بھی اسی وجہ سے ہے۔ سانس اگر رک جائے یا نبض رک جائے تو زندگی ٹھیر جائے گی بلکہ نظریۂ زندگی ہی ختم ہو جائے گا۔

(2) جس طرح وقت تسلسل میں ہے اسی طرح زندگی بھی تسلسل میں ہے۔ اسی لحاظ سے وقت کے لئے نقصان تسلسل میں ہے اور زندگی کے لئے نقصان بھی تسلسل میں ہے۔

(3) جس طرح وقت خالص اور مطلق نظریہ ہے' اس میں کوئی چیز ملائی نہیں جاسکتی۔ اسی طرح اس کا نقصان بھی بے لوث اور مطلق ہے۔ اس نقصان میں فائدہ ملایا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ مزید استعمال کے لئے وہ باقی نہیں رہا۔ وقت کے اچھے استعمال اور بُرے استعمال کا وقت کے نقصان پر کوئی اثر نہیں۔ یہ اثاثہ ہر حالت میں خرچ ہو رہا ہے۔ اس کو اس طرح سمجھئے کہ اگر وقت کا استعمال اچھے کام کے لئے ہو تو ایک سیکنڈ طویل نہیں ہوسکتا' اور اگر غلط کام کے لئے استعمال ہو تو ایک سیکنڈ قلیل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا نہ وقت پر اچھے اور بُرے کا اثر ہے نہ اس کے نقصان پر۔ بالکل اسی طرح زندگی کی اکائیوں کا نقصان بھی اچھے اور بُرے کے اثر سے مبرا ہے یعنی ہر اچھے کام والے کی سانسیں بھی ختم ہو رہی ہیں اور برے کام والے کی بھی

(4) چونکہ وقت کی رفتار ایک ہی ہے اس لئے اس کے نقصان کی رفتار بھی ایک ہی ہے۔ بالکل اسی طرح زندگی کی رفتار بھی ایک ہی ہے اور اس کے نقصان کی رفتار بھی ایک ہی ہے۔ یہ نقصان طبعی ہے۔

طویل مدتی نقصان:۔

قلیل مدتی نقصان جمع ہوتے ہوتے طویل مدتی نقصان بن جاتا ہے۔ یہ نقصان' وقفہ (ABSOLUTE RANGE) کی ابتداء سے انتہا تک محسوب ہوتا ہے۔ لہٰذا وقت کا طویل مدتی نقصان اس کے اصل وقفہ یعنی ازل سے ابد تک محسوب ہوتا ہے اسی طرح انسانی زندگی کا طویل

مدتی نقصان اس کے وقفۂ حیات (پیدائش تا موت) کے لئے محسوب ہوتا ہے۔ یہ نقصان صرف ایک انسان کا ہی نہیں بلکہ اس نقصان کا اطلاق ازل سے ابد تک انسانوں پر اور قوموں پر ہوگا۔

وقت کی اہم خصوصیات کے لحاظ سے وقت کا نقصان اور زندگی کا نقصان، قلیل مدتی جہت میں جس طرح بتلایا گیا ہے اُسی طرح طویل مدتی جہت میں بھی وہی اطلاق ہوگا۔

یہ طبعی نقصان کی بات تھی لیکن اس طبعی نقصان کا تعلق ایک اور نقصان سے ہے۔

ابتداء میں نقصان (خسران) کی جو تفہیم کی گئی ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو کسی معاملت میں نفع یا نقصان ہوسکتا ہے۔ معاملت میں لاگت کی شکل میں روپیہ پیسہ ہوسکتا ہے کچھ اور اثاثہ ہوسکتا ہے یا محنت بھی طبعی اثاثہ کے طور پر لگائی جاسکتی ہے، معاملت میں قانونِ بیع وشریٰ کے لحاظ سے ایک معیاری اجر مقرر اور متعین ہوتا ہے۔ نقصان جب ہی ہوتا ہے جب کہ تعین اور اقرارِ واقعی کے لحاظ سے اجر نہ ملا ہو۔ یہ بہت ہی اہم نکتہ ہے۔

لہٰذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ معاملت کی نوعیت کیا ہے، اس کا متعینہ اور مقررہ اجر کیا ہے اور نقصان ہو رہا ہے یا نفع؟ اگر نقصان ہو رہا ہو تو کیا معاملت کے اقرار واقعی میں اس نقصان کی تلافی کی کچھ گنجائش ہے؟ اور اس کی شرط کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر معاملت کی نوعیت اور متعینہ اور مقررہ اجر کے بارے میں اپنے کلام پاک میں ذکر بالکل صریح انداز میں فرمادیا ہے۔

مثلاً **فَاَمَّامَن ثَقُلَت مَوَازِینُہ o فَھُوَ فی عِیشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ وَاَمَّامَن خَفَّت مَوَازِینُہ o فَاُمُّہ ھَاوِیَۃ** (سورہ القارعۃ)

(جس شخص کا پلّہ بھاری ہوگا (خیر کا) وہ خاطر خواہ آرام میں ہوگا۔ اور جس شخص کا پلّہ ہلکا ہوگا (خیر کا) پس اس کی جگہ ہاویہ ہے۔

اسی طرح سورہ البقرہ کے رکوع میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے۔ **بَلٰی مَن کَسَبَ سَیِّئَۃً**

واِحَاطَت بِه خَطِیئَتہُ فاولٰئِک اَصحٰبُ النَّارِ(ج) ھُم فِیھَا خٰلِدُون ○ وَالَّذِینَ آمَنُوا وَعَملُو الصّٰلِحٰتِ اُولٰئِک اَصحابُ الجَنّۃِ(ج)ھُم فِیھَا خالِدُون○ (البقرۃ آیت ۸۱ و ۸۲)

(ہاں جوکوئی کمائے بُرائی اورگھیرے اس کوخطا اس کی ٗپس یہ لوگ رہنے والے ہیں آگ کے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جولوگ کہ ایمان لائے اور کام کئے اچھے یہ لوگ رہنے والے ہیں جنت کے ٗاوراس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان دونوں حوالوں سے صاف ظاہر ہے کہ معاملت ایمان اور عملِ صالح کی ہے اسی طرح معاملت کفراورشرکی بھی ہے۔

معاملت میں متعینہ اورمقررہ اجر بھی بتادیا گیا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کے لئے جنت ٗ کفراورشر کے لئے دوزخ۔

> اس معاملت میں اگرکسی کواُس کے ایمان اورعملِ صالح کے بدلے جنت اورکسی کوکفراورشر کے بدلے دوزخ ملتی ہے تو قانون بیع وشریٰ کے لحاظ سے کوئی بھی نقصان میں نہیں ٗ ہاں اگرایمان اورعمل صالح کے بدلے مقررہ اور متعینہ اجر جنت کی بجائے دوزخ ملے تو وہ شخص ضرور نقصان میں ہوگا۔ اور اگر کسی کو کفر اور شر کے بدلے متعینہ اورمقررہ اجر دوزخ کی بجائے اس سے بھی زیادہ اسفل اجر ملے تو وہ بھی نقصان میں ہوگا۔

لیکن اللہ بڑا انصاف والا ٗ رحیم وکریم ہے۔ وہ کبھی کسی کونقصان میں نہیں رکھتا ٗ چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔

فَالیَومَ لا تُظلَمُو نَفس'' شَیئاً وَّلا تُجزَونَ اِلُا مَا کُنتُم تَعمَلُون○ (سورہ یٰسین آیت ۵۴) پس اُس دن (یوم الحساب) نہ ذرہ برابر ظلم کیا جائے گا کسی شخص پر اورتم کوبس ان ہی کاموں کا بدلہ ملے گا جوتم کیا کرتے تھے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ''معاملت'' کے لحاظ سے انسان نقصان میں نہیں ہے۔ اسی

بات کوایک اورزاویہ سے سمجھئے۔

اگرکوئی شخص فرائض کی ادائیگی نہیں کرتا ہے (یعنی نماز، روزہ، زکواۃ، حج) تو **عملوا الصالحات** کی شرط کی تکمیل نہیں کررہا ہے۔اگرچیکہ وہ اقرارکلمہ کرتے ہوئے ایمان کی شرط مکمل کرچکا ہے۔اقرارِکلمہ طیبہ کے بعداس شخص پرلازم آجاتا ہے کہ **عملوا الصالحات** کی شرط بھی پورا کرے۔کیونکہ ایمان لانا خودایک عہد ہےاوراس عہد پرقائم رہنالازمی ہے۔لہٰذا عہد فراموشی کے لئے بھی کچھ منفی اجرضرور ہونا چاہئے۔اس کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے صاف صاف بتادی ہے سورہ البقرہ رکوع 10 میں اللہ تعالیٰ نے عہد شکنی کرنے والے کو نامکمل ایمان والاقرار دیا ہےاوراس کیلئے عذاب مقرر کیا ہے۔

لیکن اللہ نے ایک موقعہ بھی دیا ہے۔فرائض کی تکمیل نہ ہونے پرقضاءادائیگی کی اجازت ہے۔نماز کی قضاء ہوتی ہے، یہاں تک کہ عمر قضا بھی ہوتی ہے۔اسی طرح روزوں کی قضاء ہوتی ہے، عمر قضاء ہوتی ہے۔حج تو استطاعت پرمبنی ہے۔اس سلسلہ میں بھی حج بدل کی گنجائش ہے۔یعنی نقصان سے بچنے کے مواقع ضرور ہیں۔اب یہ بھی ملاحظہ ہو۔

وَمَن يَّعمَل سُوءً اَو يَظلَمُ نَفسَه ثُمَّ يَستَغفِرِ اللّٰهَ يَجدِى اللّٰهَ غَفُورَالرَّحِيماَ۔(النساء آیت 110) (اور جوکوئی عمل سوء کا مرتکب ہووہ اپنے نفس پرظلم کرتا ہے، پس وہ اپنے اللہ سے رجوع کرےاورمعافی چاہے، اللہ بے شک معاف کرے گا وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔)

یہ بھی اللہ کا وعدہ ہے۔اگرکوئی شخص زندگی کے کسی حصہ میں یہ احساس کرلے کہ وہ ایماناًاورعملاًغلطی پر ہےاوراگروہ اس احساس کے ساتھ ہی اللہ سے بصدق دل رجوع کرے، معافی چاہے توبہ کرے تو بے شک اللہ اپنی صفتِ غفاری اوررحیمی کا ضرور اظہار فرماتا ہے۔

ان امور سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ''نقصان'' کا اطلاق حتمی نہیں ہے۔**لیکن سورۃ العصر میں جو بیان ہے اس میں انسان کا حالتِ نقصان میں ہونا**

حتمی بتایا گیا ہے۔ان الانسان لفی خسر یعنی ''بیشک انسان نقصان'' میں ہے۔اللہ کے بیان میں ''بے شک'' کا استعمال اس بیان کو بالکلیہ حتمی بنادیتا ہے۔''العصر'' کی ازل سے ابد تک کی وسعت اور ''انسان'' کا عمومی استعمال یہی بتاتا ہے کہ ازل سے ابد تک یعنی تمام انسانیت خسارہ میں ہے۔لہٰذا یہ خسارہ کچھ اور ہی ہے۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ لوگ اس آیت کے بعد کی آیت سے اس کا ربط جوڑتے ہوئے خسارہ کا مفہوم نکالتے ہیں۔یعنی جو لوگ ایمان نہیں لاتے اور عمل صالح نہیں کرتے وہ خسارہ میں رہتے ہیں۔حالانکہ ایسا نہیں ہے۔جیسا کہ پہلے ہی بتایا جاچکا ہے کہ ''وقت'' اور اس کے نقصان کی خصوصیات کا اطلاق بطور شہادت ''انسان کی زندگی'' اور اس کے نقصان پر بے لوثیت کا ہے۔یعنی نقصان ''بے عملی'' کے اثر سے مبرّا ہے۔غور کرنے پر یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ نقصان پہلے ہی سے ہو چکا ہے۔''بے شک انسان نقصان میں ہے'' میں ''بے شک'' اور ''ہے'' سے یہی متبادر ہے کہ نقصان کا عمل ہو چکا پوری انسانیت پر۔لہٰذا یہ غور کرنا ضروری ہے کہ یہ عمل آخر کب ہوا' کیوں ہوا' اور نقصان سے پہلے انسان کی کیا حالت تھی۔

غور کرنے پر صاف سمجھ میں آتا ہے کہ **نقصان کی نوعیت ایک وبائی مرض کی ہے اور اس کے علاج کے بارے میں متاخر آیت میں بتلایا گیا ہے۔ الا الذین ا منوا وعملوا الصالحات** میں یہی بات بتائی گئی ہے کہ ایمان اور عملِ صالح مرض کی دوا ہیں۔لازماً یہ بات ماننی پڑے گی کہ جب تک دوا نہ ہو مرض جیسے کا ویسا رہے گا۔اس کا یہی مطلب ہے کہ مرض پہلے ہی سے لاحق ہے اور اس کا علاج ایمان اور عمل صالح سے ہے نہ کہ ایمان اور عمل صالح نہ ہونے سے مرض قائم ہوا۔یہ سچ ہے کہ جب تک علاج نہ ہو مرض قائم رہے گا۔یہی بات ہے کہ اس سورۃ میں نقصان کا ذکر پہلے اور اس کے مداوہ کا ذکر بعد میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر خسارہ کا ذکر کیا ہے جس سے خسارہ کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔

اَلَّذِینَ یَنقُضُنَ عَھدَ اللّٰہِ مِن بَعدِ مِیثَاقِہ وَیَقطَعُونَ مَآاَمَرَاللّٰہُ بِہ اَن یُّوصَلَ وَیُفسِدُ ونَ فِی الاَرضِ اُولٰئکَ ھُمُ الخاسِرُونَ (سورہ البقرۃ آیت ۲۷)

(جولوگ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدہ کو جو اللہ سے کر چکے تھے اس کے استحکام کے بعد اور قطع کرتے رہتے ہیں ان تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ نے ان کو وابستہ رکھنے کا اور فساد کرتے رہتے ہیں زمین پر پس یہ لوگ پورے خسارہ میں ہیں)

اس آیت کے بعد یہ غور کرنا ضروری ہے اور وہ بھی العصر (ازل سے ابد تک کا وقفہ) کی روشنی میں کہ کیا انسانیت کی ابتداء میں کچھ ایسا واقعہ ہوا ہے جو کہ وجہ خسارہ بنا۔ چنانچہ اسی سورۃ البقر کے رکوع 4 میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ ایسی ہی لغزش پہلے ہی انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے ہو چکی تھی۔ آدمؑ نے شیطان کے بہکاوے میں آ کر اللہ سے کئے گئے ایک وعدہ کے خلاف کام کیا۔ چنانچہ وہ تعلق جو کہ ''راست'' تھا اور وہ تعلق جو کہ ''قرب'' و ''دید'' کی حالت میں تھا اور امر اللہ تھا وہ قطع ہو گیا۔ یہی تو وہ ازلی خسارہ ہے یعنی قرب و دید سے محرومی جو سورۃ العصر میں بیان ہوا ہے۔

چونکہ اللہ نے آدمؑ کو دنیا کے پردوں میں رکھ دیا اس لئے اولادِ آدم بھی دنیا کے انہی پردوں میں رہ کر قرب و دید سے محروم ہے۔ اور یہ حالت روز آخر تک رہے گی۔ یعنی یہ خسارہ ازل سے ابد تک ہے۔ اسی لئے **والعصر** کی شہادت دی گئی ہے۔ چونکہ آدمؑ کی ایک غلطی کے لئے قرب اور دید سے محرومی (جو کہ اصولاً صرف آدمؑ کو ہونی چاہئے تھی اسمیں اولاد کا کیا قصور) نہ صرف آدم کو ملی بلکہ قیامت تک کے لئے تمام اولادِ آدم کو وراثت میں ملی۔ اسی لئے اللہ نے بالکلیہ حتمی انداز میں بتا دیا ہے کہ ''بے شک انسان خسارہ میں ہے'' اب خسارہ اور اس کی نوعیت' اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔ یہ خسارہ العصر کی شہادت سے انسان کی زندگی کی اقل ترین اکائی پر بھی ہے اور مجموعی اعتبار سے پوری زندگی پر ہے۔ (یعنی نقصان کی قلیل مدتی جہت اور طویل مدتی جہت کا اطلاق

ہے)

اتنا ہونے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کو آدم پر اور اولادِ آدم پر اتنا رحم آتا ہے کہ وہ اس خسارہ کے مداوہ کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں۔یعنی مرض کا علاج بھی مرحمت فرما دیا گیا ہے۔

اِلَّا الَّذِ ینَ آمَنُوا وَعَمِلوُا الصّالِحات ہی وہ نسخہ تریاق ہے جو مرضِ خسارہ سے افاقہ دلا دیتا ہے۔

والعصر سے یہ بھی بات بتائی جارہی ہے کہ'' بے شک انسان اس حقیقی اور انتہائی درجہ کے نقصان سے غافل ہے۔(کیونکہ یہ بات پہلے ہی بتائی جا چکی ہے کہ العصر میں ''غفلت'' کی نشاندہی بھی ہے)

آگے ارشاد ہو رہا ہے **اِلَّا الَّذِ ینَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحاتِ** یعنی سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں اور عملِ صالح کرتے ہیں (نقصان میں ہیں) یعنی جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں وہ نقصان میں نہیں رہتے۔

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ نقصان قرب و دید کی محرومی کی شکل میں ہے۔لہٰذا جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور عملِ صالح کرتے ہیں وہ نقصان میں نہیں رہتے کا مطلب یہی ہوا کہ ان لوگوں کی محرومی ختم ہو کر انہیں قرب و دید کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے۔اور پھر وہ ربط و تعلق قائم ہو جاتا ہے جو امر اللہ تھا یعنی راست تعلق استوار ہو جاتا ہے۔یعنی انسان اپنا اصلی ازلی مقام' مقام قدسی حاصل کر لیتا ہے۔**ان دو آیتوں میں دنیا میں دیدارِ الٰہی اور قربِ الٰہی کے حصول اور راست تعلق کا صد فیصد جواز موجود ہے**۔یہی بات ہے کہ صحابہ کرام کے لئے یہ سورۃ نوید مسرت دید تھی اس لئے وہ آپس میں جب بھی ملتے ایک دوسرے کو سناتے۔صحابۂ کرام کو ایک دوسرے پر تبلیغی مراحل طئے کرنا تو نہ تھا!

ایمان لانا:۔

یہ بات پہلے ہی بتائی جا چکی ہے کہ ایمان لانے کا مطلب ہے کسی کے حق ہونے پر مکمل یقین رکھنا۔

اس عمل کے اجزاء بھی بتائے جا چکے ہیں کہ رجوع کرنا' اعتماد کامل رکھنا' بے چوں و چراں اپنے آپ کو حوالہ کرنا' عہدِ وفا کرنا' ہدایت کو ماننا اور عمل کرنا۔

جب بھی ایمان کی بات ہوتی ہے وہاں صرف ''وجود'' ہی مدِّنظر نہیں رہتا یعنی صرف خدا کے ہونے پر ہی یقین کی بات نہیں ہے بلکہ اس کے تمام صفات کو مانتے ہوئے احکام کی تعمیل بھی ہونی ہے۔ اور چونکہ خسران کے تحت راست تعلق قائم نہ رہا اس لئے ہدایت اور احکام پہنچانے کا ذریعہ بھی مہیا ہونا ضروری امر ہے۔ اب یہ بات انسان کے لئے ضروری ہے کہ جو بھی ذریعۂ ترسیل پیغام ہے اس کے اعتبار کا تعین کرے۔ یعنی ذریعۂ ہدایت کے طور پر جو بھی سامنے آتا ہے اس پر یہ یقین ہونا ضروری ہے کہ وہ اتنا سچا ہے کہ وہ جو بھی بیان کر رہا ہے حقیقت میں اللہ ہی کا پیام ہے۔ لہٰذا اس بات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اللہ نے کچھ ایسا انتظام کیا ہے کہ وہ جس کو بھی اس کام کے لئے منتخب کرتا ہے اُسے پیامبری سے پہلے' دنیا والوں میں سچا ثابت کرتے ہوئے بااعتبار اور قابلِ اعتماد بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد بھی خود پیام کی سچائی ثابت کرنے کے لئے اس میں ''خیر ہی خیر'' بھر دیتا ہے۔ اس طرح ''ایمان لانا'' صرف وجود باریٔ تعالیٰ پر ہی یقین رکھنے سے تکمیل نہیں پاتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ''ہدایت'' پر اور ''ہدایت بردار'' کے حق ہونے پر کامل یقین ہونا ضروری ہے۔ یعنی اللہ پر' اللہ کے کلام پر اور رسولوں (مامور من اللہ) پر ایمان لانا ضروری ہے۔

اللہ پر ایمان لانا:۔ اقرار کرنا کہ اللہ ایک ہے اور اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اللہ اور العصر:۔

(۱) وقت میں تسلسل ہے۔ یہ تسلسل اس گواہی کے لئے ہے کہ وجود تسلسل میں ہے۔ یعنی ہر جگہ اور ہر وقت ہے۔

(۲) وقت بے لوث ہے۔ یہ بے لوثیت اس گواہی کے لئے ہے کہ وجود بے لوث ہے۔ اس میں کچھ اور شامل نہیں۔ **وَحدَہ لَا شَرِیکَ لَہ**'

(۳) وقت کے تسلسل سے جو اس کی ابتداء اور انتہا کی تشکیل ہوتی ہے وہ اس گواہی کے لئے

ہے کہ وجود ہی ابتداء ہے اور وجود ہی آخر ہے۔ هُوَالاوّل وَالاٰخِر (الحدید آیت 3)

(۴) وقت کا ربط تمام موجودات سے ہے یہ اس گواہی کے لئے ہے کہ اللہ کا تعلق تمام موجودات سے ہے۔ اللہ رب العلمین ہے' خالقِ موجودات ہے۔ اس لئے تمام موجودات کو اس کا تعلق خالق کا ہے۔ تمام موجودات کو پالنے والا ہے۔ اس لئے تمام موجودات سے اس کا تعلق رب کا ہے۔ وَالظَّاهِر والبَاطِن وَهُوَ بِكُلّ شَين ءٍ عَلِيمٌ (الحدید آیت 3) کے لئے بھی یہی گواہی ہے۔

والعصر کی دوسری اور گواہیاں عرفان کی حالتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے یہ عاجز ان کے بیان کا مجاز نہیں۔

نوٹ: ہاں بے حد اہم بات یہ ہے کہ اللہ کے ضمن میں العصر سے صرف شہادت لی جارہی ہے۔ یہاں کسی طور تمثیل مقصود نہیں۔ جس طرح اللّٰہ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرض میں ''نور'' سے دنیا کی مختلف روشنیوں کی تمثیل نہیں سمجھ سکتے بلکہ نظریاتی بناوٹ CONCEPTUALISATION سے بات سمجھائی گئی ہے۔ بالکل اسی طرح العصر سے یہاں تمثیل کسی طور مقصود نہیں۔

والعصر سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ پر ایمان لانا بھی دو جہتی ہے۔ ایک ہے قلیل مدتی جہت جس میں کلمہ کا اقرار ہوتا ہے' اللہ کے حق ہونے پر بغیر دیکھے یقین ہوتا ہے۔ یعنی یہ بالکل ابتداء ہے۔ ایک بار یقین کے ساتھ لاَ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کا اقرار۔ دوسری جہت ہے طول مدتی۔ چونکہ العصر میں تسلسل ہے اس لئے اقرار میں بھی تسلسل ہونا چاہئے۔ اور جیسے کہ العصر میں ازل سے ابد تک کا وقفہ ہے اس لئے اقرار کا تسلسل انسان کی زندگی کی ابتداء سے اختتام تک لازماً قائم رہنا چاہئے۔ چونکہ زندگی کی اقل ترین اکائی ایک سانس ہے اس لئے ایک سانس میں اقرار لا الہ الا اللہ قلیل مدتی اقرار ہے اور جب یہ اقرار زندگی کے وقفہ پر ہر سانس کے ذریعہ چھا جائے گا تو یہ طویل مدتی اقرار ہے۔ یعنی ''ابتدائی حالت'' ایمان بالغیب کا ہر لمحہ ارتقاء ہو کر وجود پر یقین اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ اِس کا نتیجہ دید ہی ہوتا ہے۔

ہدایت پر ایمان لانا:

ہدایت خیر کی تعلیم ہے۔لہٰذا اس کے بالکلیہ حق ہونے پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔جب وجود باریٔ تعالیٰ کے حق ہونے کا یقین سے اقرار کرلیا گیا تو اس وجود کے تمام متعلقات کا بھی حق پر اقرار لازم ہے۔لہٰذا جب وجود حق ہے تو اس کا کلام اور بھیجی ہوئی ہدایت بھی حق ہے۔یوں بھی مریض جب ڈاکٹر سے رجوع ہوتا ہے تو اس کی مسیحائی پر یقین رکھتے ہوئے اس کی ہر ہدایت کو مانتے ہوئے دوا کا استعمال کرتا ہے۔مثلاً ایک یرقان کے مریض کو ڈاکٹر ہدایت دیتا ہے کہ چکنائی (تیل، گھی وغیرہ) کا استعمال غذا میں نہیں ہونا چاہئے۔اور دواؤں کی مقدار اور استعمال کا طریقہ بھی بتادیتا ہے۔یہ ہدایت خود علاج کا حصہ ہے۔مریض جس طرح کہ بے چین ہے جلد سے جلد مرض سے نجات پانے کے لئے اسی درجہ پر وہ ہدایت کو مانتا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ اگر دوا کے ساتھ پرہیز بھی کرے تو مقصد جلد حاصل ہوگا۔بالکل اسی طرح انسان جو ازلی نقصان میں ہے اس کے مداوہ یا اس مرض سے چھٹکارہ پانے کے لئے بے چین ہے۔تو اُسے ضروری ہے کہ ہدایت کو علاج کا حصہ جان کر اس کے صحیح ہونے پر یقین کرے تاکہ اس پر عمل کر کے نقصان سے جلد سے جلد چھٹکارا پالے۔

والعصر کا اطلاق ہدایت پر:

(1) جس طرح وقت تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام کا تقاضہ ہے اسی طرح ''ہدایت'' بھی تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام کا تقاضہ ہے۔اگر تواریخ مذاہب اور نزول کا مطالعہ کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب جب پچھلی ہدایت کا تاثر قوم پر معدوم ہونے لگا، اور مذہب کی اصلی حالت میں انسانی تحریفات کی وجہ سے گراوٹ آتی گئی تب تب اللہ نے بندوں کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ''نئی ہدایت'' نازل فرمایا ہے۔

(2) جس طرح وقت تسلسل میں ہے اسی طرح ہدایت میں تسلسل ہے۔جب سے انسان دنیا میں آیا ہے اس کو اللہ کی طرف سے مسلسل ہدایات ملتی رہی ہیں اور ملتی رہیں گی۔(قلیل مدتی جہت

میں تفصیل آگے ملاحظہ کیجئے)

(3) جس طرح وقت بے لوث ہے اسی طرح ہدایت بے لوث ہے۔ایک تو یہ کہ ہدایت اللہ کی طرف سے آتی ہے اور اس میں کسی غیر اللہ کی ہدایت شامل نہیں کی جاسکتی۔اور دوسرا یہ کہ ہدایت ''خیر ہی خیر'' سے بھرپور ہے۔اس میں شر شامل نہیں کیا جاسکتا۔لہٰذا ہدایت بے لوث ہے۔

(4) جس طرح وقت ایک تسلسلی نظریہ ہونے کی وجہ سے اس کا ایک ازل' ابد اور درمیانی وقفہ ہوتا ہے۔اسی طرح ہدایت کا سلسلہ بھی ازل سے ابد تک ہے۔

(5) جس طرح وقت کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بانٹا جاسکتا ہے لیکن انہیں علٰحدہ نہیں کیا جاسکتا بالکل اسی طرح ہدایت کو بھی چھوٹے چھوٹے فقروں میں بانٹا جاسکتا ہے' انہیں علٰحدہ نہیں کیا جاسکتا۔مثلاً قرآن مجید سلسلۂ ہدایت کی آخری اور مکمل ہدایت ہے۔اس کو چھوٹے چھوٹے فقروں (سورتوں یا پاروں) میں بانٹا جاسکتا ہے۔لیکن انہیں علٰحدہ علٰحدہ ایک مکمل ہدایت نہیں سمجھا جاسکتا۔ البتہ ایک سورۃ یا ایک پارہ ''ایک مکمل ہدایت'' کا ''ایک حصہ'' ہے۔

(6) جس طرح وقت کی رفتار (معیار حرکت) ہر وقت اور ہر جگہ ایک ہی ہے۔اسی طرح ہدایت کا معیار بھی ہر وقت اور ہر جگہ ایک ہی ہے۔(ایمان لانے کے لزوم کے لحاظ سے) اسی لئے ہر ہدایت پر ایمان لانا ضروری ہے۔قرآن ایک ہی ہے اور ہر وقت اور ہر جگہ کے لئے ایک ہی ہے۔یعنی ہر جگہ اور ہر وقت اس کا معیار ایک ہی ہے۔

(7) جس طرح وقت جو گذر چکا لوٹ کر نہیں آتا اور ہر آنے والا وقت نیا ہوتا ہے اسی طرح ہر شریعت ہدایت جو گذر چکی لوٹ کر نہیں آتی اور ہر آنے والی شریعت ہدایت نئی ہوتی ہے۔یہی تو بات ہے کہ تورات کی شریعت کے بعد پھر تورات کی شریعت نہیں آئی بلکہ زبور کی شریعت آئی' زبور کی شریعت کے بعد پھر زبور کی شریعت نہیں آئی بلکہ انجیل کی شریعت کا نزول ہوا۔انجیل کی شریعت کے بعد پھر انجیل کی شریعت نہیں آئی بلکہ قرآن کی شریعت آئی جو کہ ابد تک رہے گی۔

(8) جس طرح وقت کا ربط تمام موجودات سے ہے اسی طرح ہدایت کا ربط بھی تمام

موجودات سے ہے۔ کتاب سماوی میں انسان کو صرف انسان کے تعلق سے ہی ہدایات نہیں ہیں بلکہ تمام موجودات کے بارے میں ہدایت ہے۔ موجودات کے متعلق ضروری علم ہے اور انسان کو نہ صرف اس علم سے مطلع کیا گیا بلکہ استعمال کے تعلق سے بھی علم دیا گیا۔ انسان کا ان موجودات سے تعلق بتلایا گیا۔

(9) جس طرح وقت کی دو جہتیں ہیں اسی طرح ہدایت کی بھی دو جہتیں ہیں قلیل مدتی اور طویل مدتی

طویل مدتی ہدایات:۔

رسولوں اور کتابوں (صحائف آسمانی) کے ذریعہ جو ہدایتیں نازل ہوئیں وہ طویل مدتی ہدایت کی جہت ہے۔ کیونکہ کلام اللہ، احادیثِ رسولؐ اور اسوہ رسولؐ پر نظام عمل صدیوں تک چلتا ہے۔

''ہدایت'' ایک بہت بڑا اور اہم منصوبہ ہے یا پراجکٹ ہے۔ ہر پراجکٹ کے لئے پہلے'' مقصد'' کا تعین، اس کی نسبت تمام ضروریات کی تفصیل اور استعمال کا طریقہ، ضروری وسائل، کام کا معیار، مرحلہ واری وقت کا تعین، ماہرین کی نگرانی، تمام مرحلوں کی تحدیدات اور کنٹرول کے ساتھ ساتھ ہر مرحلہ پر ماہرین کی رہنمائی اور تنقیح ضروری امور ہیں۔ اسی طرح ''ہدایت'' کے پراجکٹ میں بھی یہ سب امور کارفرما ہیں۔ (System,s Approach کے لحاظ سے)

ہدایت کا مقصد تو پہلے بتا دیا گیا ہے کہ یہ مرض خسارہ کا علاج ہے۔ یعنی انسان ہدایت کی پوری پوری اتباع کرے تو وہ خسارہ سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کی نسبت تمام ضروریات (حق اللہ اور حق العباد کی ادائیگی) ان کے ادا کرنے کا طریقہ، ضروری وسائل یعنی کلام اللہ، احادیث رسولؐ اسوہ رسولؐ کام کا معیار، انتہائی خلوص پر مبنی، مرحلہ واری وقت کا تعین، مختلف میعادات پر نئے رسولوں کی آمد، نئے صحائف کا نزول، ماہرین کی نگرانی کے طور پر رسولوں، رسولوں کے صحابہ، رسولوں کے خلفاء، اولیائے کرام اور پیرانِ طریقت کا انتظام، عملی تحدیدات مثلاً فرائض کی تعداد، فرض نمازوں کی تعداد، نمازوں کی رکعتوں کی تعداد، فرض روزوں کی تعداد، زکواۃ کی مقدار، شرعی

واخلاقی حدود، انفرادی اور سماجی تحدیدات، کسب کی تحدید وغیرہ وغیرہ ضروری امور ہیں اور لہذا نظامِ ہدایت بہت مکمل اور موثر ہے۔

قلیل مدتی ہدایت:۔

یہ ہدایت کا وہ حصہ ہے جو ''ہدایت پر عمل'' کے دوران ہر مرحلہ پر رہنمائی اور تنقیح کرتا ہے اس کو (MONITORING) اور (EVALUATION) کہتے ہیں۔ جو ہر پراجکٹ کے عملی مرحلہ (EXECUTION) کے دوران بے حد ضروری امور ہیں تا کہ تعینات اور معیارات کی صحیح اتباع ہو سکے اور کسی بھی ممکنہ خرابی کی بروقت روک تھام ہو سکے۔ چونکہ اس امر کا اطلاق چھوٹی چھوٹی اکائیوں (کام کی یا عمل کی) پر ہوتا ہے۔ اس لئے قلیل مدتی ہوتا ہے لیکن تسلسل میں ہوتا ہے کیونکہ پراجکٹ کی عمل آوری میں ایک مرحلہ کے بعد دوسرا مرحلہ تسلسل میں ہے۔ نظام ہدایت میں بھی یہی بات کارفرما ہے۔

یوں تو ہدایت کلام اللہ، کلام رسولؐ اور اسوۂ رسولؐ کی شکل میں رہنمائی کے لئے موجود ضرور ہے مثلاً نماز پڑھنے کی ہدایت کلام اللہ میں موجود ہے۔ احادیث موجود ہیں اور اسوۂ رسول عملی نمونہ کے طور پر موجود ہے۔ لیکن نماز کے لئے عملی طور پر خود اٹھ کھڑا ہونا، تیاری کرنا، وضو کرنا، نماز شروع کرنا، ارکان کی صحیح ادائیگی کرنا اور نماز مکمل کرنا یہ سب مرحلے عمل کے ہیں اور ایک خاص ہدایت کے تابع ہیں۔ مسجد میں اذان ہوتی ہے، انسان سنتا ہے اس کے اندر سے ''کوئی کہتا ہے'' چل اٹھ، نماز کا وقت ہو گیا۔ اسی ''اندرونی ہدایت'' کے تحت ہی تلاوت، رکوع وسجود رکعتیں غرض کہ تمام ارکانِ نماز صحیح ادا ہوتے ہیں۔ خصوصاً چار رکعت والی نماز میں غور فرمائیں۔ حالت نماز میں خشوع وخضوع کے ساتھ حد درجہ انہماک ہے۔ اس حالت میں کوئی رکعتوں کی گنتی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا دو رکعتوں کے بعد قاعدہ پھر بعد کی دو رکعتیں اور پھر اختتامی قاعدہ، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ہم سے ''کروا رہا ہے'' یہ حقیقت صرف مکمل خشوع وخضوع اور انہماک کی حالت کے لئے ہے۔ کہیں اس حالت میں رخنہ آجائے تو اس رخنہ کے وقت ''رکن'' میں غلطی کا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ اور اکثر غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ اس پر بھی اندر سے آواز آتی ہے کہ ''یہاں غلطی ہو گئی درست کر لو'' ''اندرونی

ہدایت'' کی یہ اہمیت ہے کہ اس کے بغیر ''منصوبۂ ہدایت'' کا عملی جامہ پہننا ممکن نہیں۔ چونکہ اس ہدایت کا چھوٹی چھوٹی اکائیوں پر اطلاق ہے اس لئے یہ قلیل مدتی ہدایت کی جہت ہے چونکہ انسانی زندگی کی تحریک مسلسل ہے۔ اس لئے قلیل مدتی ہدایت میں بھی تسلسل ہے اس کو وحیٔ ضمیر بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ وحیٔ راست ہے۔ حالت خشوع وخضوع میں ہی اس کا صحیح احساس ہوتا ہے۔ اگر کوئی بندہ خدا کے وجود کا تصور ہر جگہ اور ہر وقت باندھے تو یہ ''راست تعلق'' پختگی کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ اور ہر مرحلہ پر راست ہدایت ملتی رہتی ہے۔ اسی تسلسل ہدایت کے تحت انسان' حق اللہ اور حق العباد کی ادائیگی میں غلطی نہیں کر سکتا۔

العصر کی روشنی میں ہدایت کی بھی تین حالتیں ہیں۔ ماضی' حال اور مستقبل۔ سورۃ کے لفظ آمنو کا اطلاق تینوں حالتوں پر ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ چونکہ العصر کا حقیقی وقفہ (ABSOLUTE RANGE) ازل سے ابد تک درمیانی وقفہ ہے۔ اور یہ بالکلیہ اٹوٹ'' ایک'' حقیقت (ONE COMPLETE INTEGRAL ENTITY) ہے۔ اس کی شہادت کا اطلاق آمنو پر بھی اور ہدایت پر بھی ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ ہدایت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ''حال'' کی ہدایت ہی نہیں بلکہ ماضی اور مستقبل کی ہدایتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہی تو بات ہے کہ قرآن پچھلے تمام صحائف آسمانی کا شاہد ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مستقبل کی ہدایت پر کیسے ایمان لایا جائے۔ جبکہ اس کا نزول ہوا ہی نہیں۔ مستقبل کی ہدایت کے تعلق سے ''ہمیشہ حال کے صحیفۂ آسمانی'' میں خبر موجود ہوتی ہے۔ اس خبر پر ایمان لانا اور اس وعدہ کے وقوع کا انتظار کرنا اور اگر کسی شخص کے دور حیات میں یہ ''مستقبل'' آجائے تو از روئے ''ہدایت حال'' اس ''آجانے والے مستقبل پر'' ایمان لانا ضروری ہے۔

العصر سے یہ بات شدت سے ظاہر کی گئی ہے کہ ''زمانہ'' ازل سے ابد تک ''ایک'' ''مکمل'' حقیقت ہے۔ اسی طرح ''ہدایت'' ازل سے ابد تک ''ایک'' مکمل حقیقت ہے۔ اس پورے ایک پر ایمان لانا ضروری ہے ورنہ ایمان نامکمل رہ جائے گا۔ یعنی ''علاج'' نامکمل رہ جائے

گا۔لہٰذا مرض باقی رہ جائے گا یعنی ''نقصان'' باقی رہ جائے گا۔اسی طرح ہدایت کی دونوں جہتوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ورنہ نقصان ''باقی رہ جائے گا۔

اللہ نے اپنے کلام پاک میں آدمؑ کو زمین پر بھیجتے وقت ہی ہدایت بھیجنے کے وعدے کا ذکر کیا ہے۔چنانچہ البقرہ کے رکوع 4 کے اواخر میں اس وعدے کا ذکر ہے۔ارشاد ہوا ہے ''ہم ہدایت بھیجتے رہیں گے اور جو کوئی ان کی پیروی کرے گا وہ کسی اندیشے میں نہ رہے گا۔وہ غمگین نہ ہوگا۔اللہ نے **ان اللہ لا یخلف المعیاد** یعنی ''بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا'' کے تحت ہدایات کے نزول کا وعدہ پورا کرنے کا ثبوت دیا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ ان ہدایات کو صحیح طور سے سمجھنے کے لئے انسان کا متقی ہونا ضروری ہے۔ **ذٰلِکَ الکِتٰبَ لَا رَیبَ فِیہِ ھُدًی لِلمُتَقِینَ** یعنی بے شک اس کتاب (قرآن) ''میں'' ہدایت ہے متقین کے لئے۔اس کا مطلب یہی ہوا کہ قرآن کے ''اصل'' مطالب صرف متقیوں پر کھلتے ہیں اور متقی وہی ہوسکتا ہے جو ایمان کی دونوں جہتوں کو پورا کرتے ہوئے ہر لمحہ خشوع وخضوع کے ساتھ رہے۔

ہدایت بردار پر ایمان لانا:۔

یہ بات ابتداء میں بتائی جا چکی ہے کہ ''ایمان'' کا اطلاق نہ صرف ذاتِ خداوندی پر موقوف ہے بلکہ ہدایت پر اور ہدایت بردار پر بھی ہے۔لہٰذا ہدایت پر ایمان لانے کے مفہوم کے بعد اب ہدایت بردار پر ایمان لانے کو العصر کی شہادت کے ساتھ دیکھیں۔

ہدایت چونکہ من جانب اللہ آتی ہے اس لئے اس کا لانے والا بھی من جانب اللہ ہی آتا ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی شخصیت اور اس کے عہدہ پر ایمان لایا جائے۔یوں بھی جب تک کسی شخصیت کا اعتماد واعتبار کلی نہ ہو اس کی بات کو بغیر کسی حجت کے ماننا مشکل امر ہے۔لہٰذا ہدایت کے نزول سے پہلے ہی منتخبہ شخصیت کا اعتبار و اعتماد عوام میں قائم کر دیا جاتا ہے تاکہ ہدایت کی تبلیغ میں آسانی ہو۔ایسی شخصیت کے نزول کا ذکر پہلے ہی کر دیا جاتا ہے۔یعنی اس شخصیت کا بہت پہلے ہی تعین ہو جاتا ہے۔اس لئے وعدۂ نزول بھی ہوتا ہے۔لہٰذا یہ شخصیت مامور من اللہ اور موعودہ ہوتی

ہے۔ چونکہ یہ شخصیت قانون الٰہیہ کا نفاذ بھی کرتی ہے۔ اس لئے اس کی حیثیت ہمیشہ خلیفۃ اللہی بھی ہوتی ہے۔ ہدایت وصول کرنے کے لئے چونکہ راست تعلق کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ان شخصیتوں کی تطہیر پہلے ہی ہو جاتی ہے۔ جس علم سے اور جس عمل سے یہ شخصیت متذکرہ راست تعلق سے منعم ہوتی ہے اسی تجربہ سے وہ عوام کو بھی گذارنا چاہتی ہے۔ لہٰذا اس کی اس صداقت کے تحت اسی شخصیت پر ایمان لانا نہ صرف ایک صحیح عمل ہے بلکہ لازمی عمل ہے۔

''والعصر'' کا اطلاق ہدایت بردار پر:۔

ذات باریٔ تعالیٰ اور ہدایت پر العصر کی شہادت کے بعد یہی شہادت ہدایت بردار یعنی مامور من اللہ موعودہ اور خلیفۃ اللّٰہی ہستیوں پر کیا ہے ملاحظہ کریں۔

(1) جس طرح وقت تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام کا تقاضہ ہے اسی طرح بعثت رسول (مامور من اللّٰہی شخصیت) بھی تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام کا تقاضہ ہے۔ جب جب پچھلے ہدایت بردار کی لائی ہوئی ہدایت کے اثرات قوم پر معدوم ہونا شروع ہوئے اور قوم کسی ہدایت کے ''فیہہ'' سے نابلد ہو کر صرف سطحی دین پر رسماً عمل کرنا شروع کر دے تو حالتِ دین اور حالتِ قوم میں تبدیلی معکوس پیدا ہوئی ہے اور یہ تبدیلیاں ایک مقام سے دوسرے مقام کو بھی پہنچی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہوتا ہے کہ انسان کی صحیح رہنمائی کے لئے تازہ ہدایت اور تازہ ہدایت بردار کا انتظام ہو۔ تاریخ ادیان کا مطالعہ کریں تو یہ بات حقیقتً ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا العصر کی اس شہادت کا اطلاق ہدایت بردار پر پورا پورا اور صحیح ہے۔

(2) وقت تسلسل میں ہے۔ اسی طرح ''بعثت'' بھی تسلسل میں ہے۔ ایک کے بعد ایک بعثت زنجیر کی طرح مربوط عمل میں لائی گئی ہے۔

(3) جس طرح وقت بے لوث اور خالص ہے اسی طرح ہدایت بردار کی ماہیت بھی بے لوث ہے۔ ایک تو یہ کہ ہدایت بردار راست خلافتِ الٰہیہ سے ہدایت جاری کرتا ہے اس لئے معصوم عن الخطا ہوتا ہے۔ لہٰذا بے لوث ہے۔

دوسری وجہ اور بھی اہم اور راست ماہیت سے تعلق رکھتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پیغمبر اسلام حضرت سرورِ کائنات رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ کُنتُ نَبِیَاء آدَم بَینَ المَاءَ وَالطِین یعنی حضورؐ نے فرمایا میں اس وقت بھی نبی تھا جب کہ آدم کی خمیر ہو رہی تھی۔ اسکا مطلب یہی ہے کہ انسانی جسم کے وجود سے پہلے سے ہی حضورؐ کا وجود تھا۔ لہٰذا بغیر جسم کے وجود ''نور'' ہی ہوتا ہے۔ اور نور کی صفت ہے خالصیت۔ چونکہ تمام مرسلین کے لئے مصدر فیض حضورؐ ہی کا وجود ہے۔ اس لئے تمام مرسلین بھی اس خالصیت کے فیض سے متصف ہیں۔

چنانچہ العصر میں جو وقت کی خالصیت ہے اسی شہادت کے لئے ہے کہ ہدایت بردار بے لوث اور خالص ہوتا ہے۔ یہی اس کی ولایت ہے۔

(4) وقت چونکہ تسلسلی نظریہ ہے اس لئے اس کی ابتداء اور انتہا ہی اس کا اصل وقفہ ہے۔ یعنی ابتداء سے انتہا تک ''ایک'' ہی حقیقت ہے۔ بالکل اسی طرح بعثت کا نظام بھی ہے۔ ابتداء سے لے کر انتہا تک بعثت ''ایک ہی زنجیر'' ہے۔ یعنی ایک ''مکمل'' حقیقت (ONE COMPLETE INTEGRALENTITY) ہے۔

(5) وقت کو جس طرح چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بانٹا جا سکتا ہے' انہیں علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح بعثت کی زنجیر کو بھی چھوٹے چھوٹے فقروں میں بانٹا جا سکتا ہے' انہیں علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

(6) جس طرح وقت کا معیار حرکت ہر جگہ اور ہر وقت ایک ہی ہے اسی طرح بعثت کا معیار بھی ہر جگہ اور ہر وقت ایک ہی ہے۔ اسی لئے ہر بعثت پر ایمان لانا فرض ہے۔ (بعثت کا معیار اس پر ایمان لانے کے لزوم کے لحاظ سے)

(7) جس طرح وقت جو گذر چکا لوٹ کر نہیں آتا' اسی طرح بعثت جو ''مکمل'' ہو چکی لوٹ کر نہیں آتی۔ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تعلق سے یہی عقیدہ ہے کہ بعثت آخری دور میں مکمل ہوگی۔ اس لئے لوٹ کر نہیں آنے والی بعثت جو کہ مکمل ہوتی ہے اس کا اطلاق حضرت عیسیٰ پر نہیں ہوگا)

(8) جس طرح وقت کا تعلق تمام موجودات سے ہے اسی طرح کسی بھی بعثت کا تعلق تمام

موجودات سے ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضور سرور کائنات رحمۃ اللعالمینؐ ہیں۔چونکہ تمام مرسلین اسی منبعٔ فیض سے فیض یاب ہیں۔اس لئے تمام مرسلین بھی موجودات سے اسی صفت سے تعلق رکھتے ہیں۔

(9) جس طرح وقت کی تین حالتیں ہیں ''ماضی' حال اور مستقبل''اسی طرح بعثت کے لئے بھی یہی تین حالتیں ہیں۔

ہدایت بردار کے لئے العصر کی جو شہادت اوپر پیش کی گئی اُس کے فقرہ ۴'۵'۹ کے مطابق بعثت کی پوری زنجیر پر''ایک مکمل''حقیقت کی طرح ایمان لانا ضروری ہے۔ہر''حال'' کی بعثت پر ایمان لانے کے ذریعہ ہر''ماضی'' کی بعثت پر ایمان لایا جاتا ہے۔لیکن کسی مستقبل کی بعثت پر ایمان کیسے لا سکتے ہیں جب کہ وہ وقوع پذیر ہی نہیں ہوئی۔یہ ایمان اسی طرح سے ہے کہ ہر''حال'' کی'' ہدایت''اور بعثت کے ذریعہ مستقبل کی بعثت کے بارے میں وعدہ اور خبر دیدی جاتی ہے۔لہٰذا جب ''حال'' کی''ہدایت''اور بعثت پر ایمان لایا گیا تو اُن سے جاری کردہ خبر اور وعدہ پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے۔اور مستقبل کی بعثت کا انتظار اسی ایمان کے تحت کرنا فرض ہے۔جب بھی یہ''مستقبل ''''حال''بن کر آجائے تو پھر پچھلی خبر پر ایمان کے تحت اس''حال''بن کر آجانے والے''مستقبل'' پر ایمان لانا فرض ہے۔جب ہی پچھلا ایمان''مکمل''ہوگا ورنہ نہیں۔اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں نامکمل ایمان رکھنے والوں کے بارے میں عذاب کا صریح انداز میں ذکر کیا ہے۔سورہ البقرہ رکوع (10) میں یہی بات بتائی گئی ہے۔

کتاب عیسیٰؑ میں حضرت احمد کی بعثت اور فارقلیط کی بعثت کی خبر موجود ہے۔لہٰذا جب رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ مبارک ہوئی اور حضورؐ نے جب دعویٰ نبوت فرمایا تو کفار اور یہودیوں نے اعتراض کیا کہ انجیل میں تو آنے والے نبی کا نام **''احمد''** ہے تو حضورؐ نے فرمایا کہ **''احمد''** بھی میرا ہی نام ہے''۔اسی طرح عیسیٰؑ نے فرمایا کہ ہم انبیاء تمہارے پاس تنزیل (کلام پاک) لائے ہیں۔تاویل (معنی) فارقلیط آخری زمانہ میں لائے گا۔مفسر عبدالرزاق کاشی نے فارقلیط سے مہدی علیہ السلام کی مراد لی ہے۔

جس طرح انجیل مقدس میں ''احمد''اور''فارقلیط'' کی خبر ہےاورعیسیٰؑ کا بیان بھی اس تعلق سے خبر کی نوعیت رکھتا ہے بالکل اسی طرح قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ نے بھی مستقبل کی بعثوں کے بارے میں خبر دی ہے۔

قرآن میں مستقبل کی خبر:۔

(1) اَفَمَن کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَبِّہٖ وَ یَتْلُوہ' شَاھِد' مِنْہُ وَ مِنْ قَبْلِہٖ کِتٰبُ مُوسَیٰ اِمَامًاو رَحْمَۃً ط اُولٰئِکَ یُؤْمِنُونَ بِہٖ مِن یَّکْفُرْبِہٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُمَوْعِدُہ فَلَاتَکُ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْہُ ط اِنَّہُ الْحَقُ مَنْ رَّبِّکَ وَ لٰکِنَّ اَکْثَر النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ o (سورہ ھود آیت 17)

یعنی کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے بیّنہ پر ہو اور اس کے پیچھے (اس کے رب کی طرف سے) قرآن گواہ ہو اور اس سے پہلے کی کتابِ موسیٰؑ بھی جو امام اور رحمت ہے۔اور یہ سب لوگ اس کی تصدیق کرتے ہیں اور جو بھی کفر کرے ان جھتوں میں سے' اس کی وعدہ گاہ جہنم کی آگ ہے۔پس (اے محمد) اس (بعثت) کے بارے میں شبہ میں مت رہو کیونکہ وہ تیرے رب کی طرف سے بے شک حق ہے لیکن اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔(سورہ ھود آیت 17)

(2) فَسَوْفَ یَاتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُونَہ' الایہ۔یعنی اللہ عنقریب ایک ایسی قوم کو لائے گا کہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتی ہے (المائدہ ۵۴)

(3) ثُمَّ اِنَّ عَلَّیْنَا بَیَانَہ پھر اس کا (قرآن کا) بیان کرا دینا بھی ہمارا ذمہ ہے۔(سورہ القٰیمہ) یوں تو اسی ضمن کی قرآن مجید میں ۱۸ آیتیں موجود ہیں لیکن یہ تین مندرجہ بالا آیتیں ہی مستقبل کی بعثت کے بارے میں خبر کا ایمان دینے کے لئے کافی ہیں۔

پہلی آیت سورہ ھود کی ہے جس میں مکمل طور سے بتا دیا گیا ہے کہ ایک شخصیت کی بعثت ہوگی جو اپنے رب کی طرف سے بیّنہ پر ہوگی اور جس کا شاہد قرآن اور کتابِ موسیٰؑ ہے۔اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بعثت کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ کو یہ یقین دلایا ہے کہ تم اس بعثت کے تعلق سے شبہ

میں مت رہو' بے شک وہ اپنے رب کی طرف سے حق ہے۔ پھر اس بعثت اور شخصیت پر ایمان نہ لانے والوں کے بارے میں عذاب النّار کی خبر ہے۔ یہ بھی خبر دیدی گئی ہے کہ اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ایمان والے کے لئے حقیقت میں صرف یہ ایک ہی آیت کافی ہے کہ اس خبر پر ایمان لائے۔ خبر کے لحاظ سے بعثت کے وقوع کا انتظار کرے اور جب بھی مستقبل میں کسی نے صاحب بیّنہ ہونے کا دعویٰ کیا اس کی طرف جائیں، تحقیق کریں اور اگر دعویٰ سچ ہو تو فوراً ایمان لائیں۔

نوٹ: یہ بات ثابت ہے کہ والعصر کی گواہی کے تحت ہدایت (کتابی ہدایت) کا وقفہ (RANGE) کتابِ موسیٰ سے قرآن مجید تک ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں جس صاحب بیّنہ کا ذکر ہے اس کا گواہ کتابِ موسیٰ اور قرآن مجید بتلائے گئے ہیں۔ اسی کا ذکر گر انجیل مقدس میں بھی ہے۔ (فارقلیط) تو زبور میں بھی ہونا ضروری ہے۔

چنانچہ حسب ذیل آیت سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْکَ الْکِتٰبِ بالْحَقِّ مُصَدِّ قاً لِّمَا بَيْنَ يَدَ يْهِ مِنَ الکِتٰبِ وَ مُهَيْمِناً عَلَيْهِ فَاحکُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآاَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَائَکَ مِنَالْحَقِّ (ط) المائدہ ۴۸

ترجمہ: اور اُتارا ہم نے تجھ پر (اے محمد) کتاب سچی (قرآن) جو تصدیق کرنے والی ہے سابقہ کتابوں (توریت، زبور، انجیل) کی اور ان کے مضامین پر محافظ ونگہبان۔ لہٰذا (اے رسول) فیصلہ کرو (ان کے معاملات کا) موافق اس کے جو اتارا اللہ نے (قرآن) اور ان (یہود ونصاریٰ) کی خواہش پر مت چلو۔ سیدھا راستہ چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا (قرآن)

لہٰذا جب اس صاحب بیّنہ ہستی کا ذکر چاروں کتابوں میں ہے اور بحکم ایمان ہے تو اس پر ایمان لانا محکم ہے اور ضرورت دین ہے۔

دوسری آیت میں قوم کی بعثت کا ذکر ہے۔ قوم کے ذکر سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اس کا ایک بانی بھی ہے بغیر بانی کے بغیر سردار کے بغیر امام کے قوم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا قرآنِ مجید میں''

قوم موسیٰ'' کا لفظ کئی جگہ آیا ہے۔اس لئے جب اللہ نے ایک ایسی قوم کی بعثت کا وعدہ کیا ہے جو اس کو چاہے گی اور اللہ اس قوم کو چاہے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قوم کے ساتھ اس کا بانی' اس کا سردار' اس کا امام بھی مبعوث ہوگا۔

تیسری آیت میں قرآن کے بیان یعنی مطالب برمراد اللہ کی تفہیم کے لئے کسی شخص کی بعثت کی خبر ہے۔''کرادینا'' سے ظاہر ہے کہ کسی شخص کے ذریعہ کرادینا مقصود ہے۔انجیل مقدس سے بھی فارقلیط کی جو خبر ملتی ہے اس میں بھی ''تاویل'' کے لئے فارقلیط کی بعثت کی خبر ہے۔مفسر عبد الرزاق کاشی نے یہ خبر بعثت مہدی علیہ السلام سے متعلق بتائی ہے۔

احادیثِ رسولؐ میں مستقبل کی بعثت کی خبر:

اللہ تعالیٰ نے سورۃ النجم میں وضاحت کی ہے۔ **وماینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ** یعنی وہ (رسول اللہؐ) جو فرماتے ہیں اپنی طرف سے نہیں بلکہ وہی کہتے ہیں جس کی ان کو وحی کی جاتی ہے۔لہٰذا وہ خبر جو کہ احادیثِ نبویؐ سے ملتی ہے من جانب اللہ ہی ہوتی ہے۔اس پر ایمان لانا فرض ہے۔

احادیث نبویؐ میں دو ہستیوں کی بعثت کے تعلق سے خبر ملتی ہے۔ **چنانچہ ''سلسلۃ الذھب'' کی حدیث شریف ہے۔''وہ اُمت کیسے ہلاک ہوگی جس کی ابتداء میں' میں ہوں اور مہدی وسط میں اور مسیح اس کے آخر میں** لیکن اس کے درمیان غیر مستقیم لوگ ہوں گے جو نہ مجھ سے ہیں اور نہ میں اُن سے ہوں۔

اس حدیث نبوی صلعم سے حضرت مہدی علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی خبر دی گئی ہے۔لہٰذا کلام اللہ اور حدیثِ نبویؐ سے مستقبل کی بعثتوں کے بارے میں خبر موجود ہے۔''العصر'' کی روشنی میں آمنوا کا اطلاق ان بعثتوں پر ضرور ہوگا۔یعنی قرآن کے نزول کے لحاظ سے مستقبل اور نبی کریمؐ کی بعثت کے لحاظ سے مستقبل کے تعلق سے بعثتوں کی جو خبر ہے اس پر ایمان لانا فرض ہے۔اسی دلیل سے وقوع بعثت پر اور شخصیتِ بعثت پر ایمان لانا فرض ہے۔

بحکم قرآن سورہ ھود کی آیت 17 سے مستقبل کی بعثت پر ایمان لانا فرض ہے۔ حدیثِ نبویؐ کے لحاظ سے بھی اس طرح کا ایمان لانا فرض ہے۔

حدیثِ ثوبانؓ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' پھر اللہ کا خلیفہ مہدی آئے گا پس جب تم اس کی خبر سنو تو اس کے پاس جاؤ اور اس کی بیعت کرو اگر چیکہ تمہیں برف پر سے رینگتے ہوئے جانا پڑے کیونکہ وہ مہدی اللہ کا خلیفہ ہے۔ (ابن ماجہ)

اس طرح العصر کی شہادت ہدایت بردار پر ایمان لانے کے حکم کے متعلق ماضی، حال اور مستقبل کے لئے ثابت ہے۔

عملوا الصلحت:۔

عمل کرنا اور وہ بھی صالح یعنی جو بھی ہدایت کلام اللہ کے ذریعہ دی گئی ہے اور جو بھی ہدایت، ہدایت بردار سے پہنچی ہے اس کی پوری پوری اتباع عملاً کرنا۔ چونکہ عملِ رسول اللہؐ خود قرآن شریف کی مکمل طور پر عملی تفسیر ہے۔ اسی لئے **عملوا الصلحت** کا مطلب ہے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر رسول اللہؐ کی اتباع کرنا۔ (اسلام، ایمان اور احسان کے میدانِ عمل میں)

یوں بھی صراطِ مستقیم پر چل کر ہی عملِ صالح کیا جا سکتا ہے۔ اور ہر مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ صراطِ رسولؐ ہی صراط مستقیم ہے۔ اب دیکھنا یہ ضروری ہے کہ صراطِ رسولؐ کیا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے صراطِ رسولؐ کی نہ صرف نشاندہی کی ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کو ہدایت بھی دی ہے کہ اہلِ ایمان کو اسی صراط کی دعوت دیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِي اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي الایۃ (سورہ یوسف)

یعنی کہدو (اے محمد) یہ میری (محمد کی) راہ ہے اور میں (محمد) اللہ کی طرف بصیرت پر بلاتا ہوں میں اور میرا تابع تام۔

اس سے مکمل طور پر اور بالکل صریح انداز میں پتہ چل گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی راہ ''**بصیرت**'' کی (**دیدارِ خداوندی**) کی راہ ہے۔ اور اسی راہ پر چلنے کی دعوت تمام اہل ایمان کو بحکم

خداوی جارہی ہے۔لہٰذا یہ دعوتِ بصیرت نہ صرف رسول اللہ ﷺ نے دی ہے بلکہ حضورؐ کے تابع تام نے بھی دی ہے۔ یہ تابع تام کون ہے؟ خود رسول اللہ صلعم نے اس کی نشاندہی کی ہے۔

حدیث شریف ہے" **المهدی منی یقفوا ثری ولا یخطی** "یعنی مہدی مجھ سے ہے میرے قدم بہ قدم چلے گا اور خطا نہ کرے گا۔

چنانچہ بعثتِ مہدیؑ خود دعوتِ بصیرت کے لئے ہے۔ سورہ یوسف کی اس آیتِ شریفہ سے اس بات کی بھی تصدیق ہوجاتی ہے کہ سورۃ" **والعصر**" میں جو انسان کا ازلی نقصان بتایا گیا ہے وہ ہے قرب و دیدار سے محرومی۔ اسی محرومی سے نجات دلانے کے لئے دعوۃِ رسولؐ اور دعوتِ تابع تام رسولؐ ہے۔ لہٰذا جب تک اس دعوت پر ایمان نہ لایا جائے اور اس راہ پر عمل نہ کیا جائے نہ تو ایمان کی تکمیل ہوگی اور نہ عملِ صالح کی۔ لہٰذا "خسارہ" باقی رہے گا۔

یہ بات بتادی جاچکی ہے کہ پورے کا پورا اسوۂ حسنہ رسولؐ عملِ صالح ہے۔ اس میں سلوک برنباء حق اللہ اور سلوک برنباءِ حق العباد دونوں شامل ہیں۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ انسان جیسے جیسے حق اللہ کی ادائیگی کا معیار بلند کرتا جاتا ہے ویسے ویسے معیار ادائیگی، حق العباد بھی بلند ہوتے جاتا ہے۔ کیونکہ حق اللہ کی ادائیگی میں جیسے جیسے خشوع وخضوع بڑھتا جائے گا ویسے ویسے انسان اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہر کام ایسا کرنے کی کوشش کرے گا جیسا کہ اس کام کا حق ہے۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ سلوک بھی "رحمت" کی رعایت سے ہی ہوگا۔ کیونکہ اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ حق العباد کے تعلق سے حسنِ سلوک بھی ایمان کا جز ہے اس لئے عمل صالح ہے۔ سورہ البقر کے رکوع ۱۰ سے اس کی تشریح ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ترجمہ: اور وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے لیا قول واقرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا کسی کی بجز اللہ تعالیٰ کے اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گذاری کرنا اور اہلِ قرابت کی بھی اور بے باپ کے بچوں کی بھی اور غریب محتاجوں کی بھی اور عام لوگوں سے بات اچھی طرح خوش خلقی سے کہنا اور پابندی رکھنا نماز کی اور ادا کرتے رہنا زکواۃ۔ پھر تم اس قول واقرار سے پھر گئے بجز

معدودے چند کے.....اور وہ زمانہ بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے یہ قول لیا تھا کہ باہم خونریزی مت کرنا اور ایک دوسرے کو ترک وطن مت کروانا۔ پھر تم نے اقرار بھی کرلیا' اور اقرار بھی ضمناً نہیں بلکہ ایسا صریح جیسا تم شہادت دیتے ہو۔ پھر تم یہ قتل وقتال بھی کرتے ہو اور ایک دوسرے کو ترکِ وطن بھی کرواتے ہو..... تو پس یوں کہو کہ کتاب کے بعض احکام پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے..... تو کیا سزا ہو ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں سے ایسی حرکت کرے بجز رسوائی کے دنیوی زندگانی میں اور روز قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جاؤ گے (سورہ البقرہ رکوع ۱۰)

اس بات سے واضح ہے کہ حق العباد بھی ایمان کا جز ہے۔ اس کی احسن طور پر ادائیگی ہی ایمان کا تحفظ کرتی ہے ورنہ ایمان نامکمل رہ جاتا ہے اور ''نقصان'' باقی رہ جاتا ہے۔

اللہ کی عبادت جب انسان پورے خشوع وخضوع سے کرتا ہے تو انسان پر یہ حقیقت بھی کھلنے لگتی ہے کہ ایک انسان کے پاس دوسرے انسان اور مخلوقات امانت ہیں اللہ کی۔ لہٰذا اس امانت کی ہر طرح تحفظ کی ضرورت ہے۔

سورہ العصر میں مرض کی نوعیت اور اس کا علاج بتلا دیا گیا ہے۔ اگر مریض حقیقت میں مرض سے افاقہ چاہتا ہے تو اُسے ضروری ہے کہ وہ بتلایا ہوا نسخۂ تریاق استعمال کرے لیکن چونکہ العصر میں غفلت کی بھی نشاندہی ہے۔ اس لئے اکثر لوگ اس مرض سے پہلے تو غفلت برتتے ہیں یا پھر اگر مرض کا علم ہو بھی جائے تو علاج سے غفلت برتتے ہیں۔ یا تو علاج کرتے ہی نہیں یا نامکمل علاج کرتے ہیں یا غلط علاج کرتے ہیں۔

العصر کی شہادت کی تائید حسبِ ذیل آیت سے ہوتی ہے۔ **فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبّه' فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحاً وَّلَايُشْرِك بِعِبَادِهٖ رَبه اَحَدا** (سورہ الکھف)

یعنی پس جو شخص اپنے پروردگار کے دیدار کا آرزومند ہے پس اس کو عمل صالح کرنا چاہئے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔

حدیث جبرئیلؑ سے بھی دیدارالٰہی کی تعلیم دی گئی ہے۔

ان تَعْبُدُ اللّٰہ کَانکَ تَراہ وَاَنْ لَّم یکُن تراہ فَانَّہ یَرَاک

یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر نہ دیکھ سکو تو سمجھو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اگر دیدارِ الٰہی ناممکن ہوتا تو اس حدیث کا پہلا حصہ **ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ** غیر ضروری ہوتا۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوتا کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ (یہ سمجھ کر کرو) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ ''اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو'' کہنے سے آخر اس موقف کے لحاظ سے کیا فائدہ اور کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ اگر ناممکنات کا موقف اختیار کیا جائے تو اس حدیثِ احسان کا پہلا حصہ یعنی شروعات ہی الفاظِ زائد و بے معنی قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا یہ موقف صرف حالتِ غفلت کا ہے جو العصر میں بتایا گیا ہے۔

عملِ صالح کے عنوان کے تحت اتنی سب باتیں سامنے رہنا اس لئے ضروری ہے کہ جب تک صحیح منزل کا تعین نہ ہو اور منزل کا پتہ معلوم نہ ہو عمل کو سمت نہیں مل سکتی اور انسان صحیح سمت نہ ملنے کی وجہ سے گم کردہ راہ ہو جاتا ہے۔

العصر کی شہادت کا اطلاق عمل صالح پر:۔

(1) جس طرح وقت تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام کا تقاضہ ہے اسی طرح عمل صالح بھی تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام کا تقاضہ ہے۔ تبدیلیٔ حالت اس طرح سے کہ انسان جو حالتِ قرب و دید میں تھا' اس سے محروم ہو گیا۔ تبدیلیٔ مقام اس طرح سے کہ انسان جو مقامِ قدسی پر تھا اس سے اُس کا تنزل ہو گیا۔

(2) جس طرح وقت میں تسلسل ہے اسی طرح عملِ صالح میں بھی تسلسل ہے۔ (ذکرِ خفی اور ذکرِ دوام کے ذریعہ)

(3) جس طرح وقت ایک بے لوث اور خالص نظریہ ہے اسی طرح عمل صالح بھی ایک بے لوث اور خالص نظریہ ہے۔ دعوۃِ بصیرت کے تحت عملِ صالح کے سواء قرب و دید کے اور کچھ مضمر

نہیں۔یعنی حصولِ متاعِ دنیا کے لئے یہ عمل نہیں ہے۔خالصتاً اللہ کیلئے ہے۔

(4) جس طرح وقت ایک تسلسلی نظریہ ہے اور اس کا وقفہ(ABSOLUTE RANGE)اس کی ابتداء اور انتہا سے بنتا ہے' اسی طرح عملِ صالح بھی تسلسل میں ہے اور انسان کی ابتداء زندگی سے انتہا تک اس کا وقفہ ہے۔ چنانچہ زندگی کا ابتدائی حصہ خود معصومیت کا ہوتا ہے اور شعوری زندگی میں مذہبی تعلیم و تربیت سے عمل صالح کے تسلسل کا انتظام کیا جاتا ہے۔

(5) جس طرح وقت کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بانٹا جاسکتا ہے اسی طرح عملِ صالح کو بھی چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔(تفصیل آگے ملاحظہ کریں)

(6) وقت کا معیارِ حرکت جس طرح ایک ہی ہے اسی طرح عمل صالح کا وہ معیار جو صراطِ مستقیم' صراطِ رسولؐ اور دعوۃ بصیرت کے تحت' ایک ہی ہے۔اور وہ ہے ترک دنیا اور تکمیل فرائض ولایت۔ اس سے ہٹ کر نہ سمت مل سکتی ہے اور نہ منزل۔

(7) جس طرح وقت جو گذر چکا لوٹ کر نہیں آتا اسی طرح جو عمل گذر چکا لوٹ کر نہیں آتا۔ یعنی تیر جو کمان سے نکل چکا وہ لوٹکر نہیں آتا۔اسی لئے عمل کی ہمیشہ حفاظت ضروری ہے۔یہی بات ہے کہ ہر لمحہ تصورِ الٰہی اور خشوع وخضوع سے گذرنا چاہئے۔

(8) جس طرح وقت کا تعلق تمام موجودات سے ہے اسی طرح عمل کا تعلق بھی تمام موجودات سے ہے۔انسان کے کسی بھی عمل کا اثر دوسرے انسان پر ہوسکتا ہے۔لہٰذا حق العباد کے تحفظ کے احکام پر تمام شرعی احکام جو اجماعی حیثیت کے ہیں یا سماجی حیثیت کے ہیں اسی نوعیت کے ہیں۔

(9) وقت چونکہ متحرک ہے اس کی تین حالتیں حال' ماضی اور مستقبل ہیں' اسی طرح عمل کی بھی تین حالتیں ہیں۔حال' ماضی اور مستقبل۔اور تسلسل کی وجہ سے جس نوعیت سے صراطِ مستقیم پر ایک ایک قدم آگے بڑھتا جائے گا عمل کی نوعیت میں بھی اضافہ آتا جائے گا۔یہ بات اتنی اہم ہے کہ جتنا جتنا فاصلہ طئے ہوتے رہے گا اور منزل کے قریب ہوتے جائیں گے کسی بھی غفلت سے نقصان کا شدید ترین احساس پیدا ہوجاتا ہے۔لہٰذا یہی وجہ ہے کہ ہم کو غفلت کی اجازت نہیں ہے۔کیونکہ

اس سے حالت اور مقام کی تبدیلی رک جائے گی۔جس طرح وقت کے لئے تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام میں کسی بھی رکاوٹ سے نظریۂ وقت ختم ہوجاتا ہے اور جس طرح سانس کی رکاوٹ سے نظریۂ زندگی ہی ختم ہوجاتا ہے اسی طرح عمل کی غفلت سے مقصدِ عمل کی ہلاکت واقع ہوتی ہے۔لہٰذا تحریکِ عمل کا تسلسل انتہائی اہم ہے۔

عمل صالح کی طویل مدتی جہت:۔

جس طرح وقت کی دو جہتیں ہیں اسی طرح عمل صالح کی بھی دو جہتیں ہیں۔طویل مدتی جہت اور قلیل مدتی جہت میں ایسے امور شامل ہیں جس کی ادائیگی میں زیادہ وقت درکار ہے۔تمام عبادات اور فرائض اسلام اسی جہت کے ہیں۔نماز کی ادائیگی کے لئے خشوع وخضوع کے لحاظ سے چھوٹی سی چھوٹی نماز کے لئے بھی سانس کی کئی اکائیوں کا وقت چاہیئے۔اسی طرح فرض روزہ کی ادائیگی ایک ماہ طویل ہے۔زکواۃ ایک سال پر محیط ہے۔اسی طرح حج بھی عبادت کی طویل مدتی جہت ہے۔

قلیل مدتی جہت:۔

جس طرح وقت کی قلیل مدتی جہت ایک سکنڈ ہے اور زندگی کی قلیل مدتی جہت ایک سانس ہے اسی طرح عمل صالح کی بھی قلیل مدتی جہت ہے۔چونکہ عمل کا تعلق انسانی زندگی سے ہے اسی لئے عمل کی قلیل مدتی جہت کا تعلق انسان کی اقل ترین اکائی زندگی سے ہے اور یہ ہے ذکرِ خفی اور ذکرِ دوام کا عمل جو ایک سانس کی مدت پر محیط ہے اور سانس کی طرح تسلسل میں ہے۔یہ عمل ایسا ہے کہ انسان کو غفلت اور اس کے نقصان سے بچاتا ہے۔

غور کیجئے نمازِ فجر سے نماز ظہر تک کا وقفہ طویل' نماز ظہر سے نماز عصر تک کا وقفہ طویل' نماز عصر سے نماز مغرب کا وقفہ طویل' پھر نماز مغرب سے نماز عشاء تک کا وقفہ طویل' اور نماز عشاء سے پھر نمازِ فجر تک کا وقفہ طویل اگر غفلت میں گذر جائے تو نقصان کا احتمال رہتا ہے۔اس غفلت سے اور اس کے منتج نقصان سے بچنے کے لئے ذکرِ خفی اور ذکرِ دوام کی تعلیم ہے۔

ہدایت کی قلیل مدتی جہت (وحیٔ ضمیر) جو کہ عملی تحریک کے لئے بے حد ضروری ہے اور

جس کے بغیر عمل کی صورت ممکن ہی نہیں۔ کے حقیقی اور صحیح احساس کے لئے عملِ صالح کی یہ قلیل مدتی جہت (ذکرخفی اور ذکر دوام) بے حد اہم ہے۔ اسی لئے تمام عبادات میں ذکر کا مقام افضل ہے۔ اس کے بغیر وحی ضمیر کا صحیح احساس ممکن نہیں۔

یوں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''ہم نے انسانوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے'' چنانچہ غور کا مقام ہے کہ اقل ترین مدت ایک سیکنڈ میں آخر کس قسم کی عبادت کی جاسکتی ہے۔ یہ عبادت سوائے ذکرِ خفی اور ذکر دوام کے کچھ اور نہیں ہوسکتی۔ یوں بھی العصر کی شہادت جو خصوصیتِ تسلسل کیلئے ہے اس کی تکمیل اسی سے ہوسکتی ہے۔ ورنہ جیسا کہ دیکھا جاسکتا ہے کہ نمازوں کا درمیانی وقفہ اتنا طویل ہے کہ امورِ تسلسل قائم نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا ذکر خفی اور ذکر دوام کا عملِ صالح بحیثیت فرض اطلاق صحیح ہے اور ضروری ہے۔

رسول اللہؐ کی دعوۃِ بصیرت کی اتباع کرنے والوں کیلئے عبادت کا یہ تسلسل ضروری ہے۔ اس لئے کہ اسی حالت میں ''نقصان'' کا مداوہ ہوتا ہے۔ کسی بھی وقت رحمتِ خداوندی کا ظہور ہوسکتا ہے۔ اگر اس حالت میں رخنہ آجائے اور رکاوٹ آجائے تو مقصدِ عملِ صالح کی ہلاکت کا اندیشہ رہتا ہے۔

یوں بھی جب تک مرض کے افاقہ کے لئے نسخہ کا پورا پورا استعمال نہ ہو افاقہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اور یہ نسخہ ایمان و عمل کی طویل مدتی اور قلیل مدتی جہتوں پر محیط ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃ تنھی عَن الفحشاء وَالمُنکر وَلَذِکر اللّٰہ اکبَر (سورہ عنکبوت 25)

یعنی بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے لیکن اللہ کا ذکر تو سب سے بڑا ہے۔

اسی طرح ارشاد ہوا ہے۔ **الذین یذکرون اللّٰہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم** یعنی کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے ہر حالت میں ذکر کرتے ہیں۔ ایک سانس بھی خالی نہیں جانے دیتے۔ اسی سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ذکر کا عمل افضل عبادات ہے۔ کیونکہ یہی تو وہ عمل ہے جس سے وحدہ لاشریک لہ کا مسلسل تصور قائم رہتا ہے۔ کیونکہ یہ عمل شیطان کی مداخلت کو ہر لمحہ روکتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جس سے عبادت کے دوران خصوصاً نماز کے دوران سوائے اللہ

کے تصور کے اور دوسرا تصور آنے نہیں دیتا۔ اور ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اللہ کو دیکھ کر اللہ کی عبادت کر سکتے ہیں اور اسی مرحلہ سے یہ بات پوری طرح سچ ہوسکتی ہے جب کوئی کہتا ہے۔ وماانامن المشرکین یعنی میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

وَتَوَاصَوْبِالْحَقِّ وَتَوَاصَوبِالصَّبْر

یعنی حق کو اس طرح پیش کرو کہ جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اور یہ کام صبر سے کرو۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ خصوصیات تبلیغی مرحلہ کے ہیں۔

العصر کی شہادت کے لحاظ سے حق کو پیش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے غفلت کے پردوں کو ہٹانا ضروری ہے۔ تصورِ حق جب ہی پیدا ہوسکتا ہے اور جب ہی قائم ہوسکتا ہے جب غفلت کے ضال سے کسی کو نکال لائیں۔ اس بات کے لئے جہدِ مسلسل اور قوتِ برداشت کی ضرورت ہے۔

حضور اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ اس آیت کی مکمل عملی تفسیر ہے۔ لہٰذا اس بات کے لئے بھی اتباع رسولؐ سلامتی کا ضامن ہے۔

ان احکام کا تعلق حق العباد سے ہے۔ حق کی تلقین کا حق بہ سلوکِ رحمت ہر بندے کا حق ہے۔ اسکا مطلب یہی ہے کہ حقیقت کا جو بھی علم حاصل ہو چکا وہ صرف اپنی ہی حد تک مت رکھو بلکہ دوسروں کو بھی اس علم سے فیض حاصل کرنے کا موقعہ دو۔ ان کی تربیت علمی اور عملی دونوں طریقوں پر کرو اور صبر و استقلال سے کرو۔

العصر کی شہادت ان دو امور **وتواصوبالحق** اور **وتواصوابالصبر** پر بھی ہے۔

(1) جس طرح وقت تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام کا تقاضہ ہے اسی طرح حق کی تبلیغ و تربیت اور اس عمل میں صبر کا استعمال تبدیلیٔ حالت اور تبدیلیٔ مقام پر منتج ہے۔

تربیتِ سلوک کے دوران طالب کی حالت جیسے جیسے تبدیل ہوتی جاتی ہے اور اس کا مقام عرفانی سطحوں پر جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا ہے اسی لحاظ سے تربیت اور تلقین بھی تبدیل ہوتے جاتی ہے۔ لہٰذا ایک مبتدی کی تربیت اور ایک جو کچھ آگے بڑھ گیا ہے اُس کی تربیت میں فرق ہوتا ہے۔

(2) جس طرح وقت میں تسلسل ہے اسی طرح تربیت میں بھی تسلسل ہے اور صبر میں بھی تسلسل ہے۔

(3) جس طرح وقت ایک خالص اور بے لوث نظریہ ہے اسی طرح تربیت بھی خالص اور بے لوث ہوتی ہے۔ صرف للّٰہیت ہی پائی جاتی ہے۔ کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں رہتی۔ چونکہ یہ تربیت ''حق'' کی ہے اور ''حق'' سے ہے۔ اس لئے اس میں حق کے سوائے کچھ اور بطور نصاب نہیں ہوتا۔ دنیا داری سے اس کو ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ صبر کا دامن بھی نامساعد سے نامساعد حالات میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔

(4) جس طرح وقت کے تسلسلی کردار سے اس کے ابتداء اور انتہا کے بیچ ایک وقفہ ہوتا ہے اسی طرح تربیت بھی تسلسلی کردار کی حامل ہے اور انسان کی شعوری زندگی کی ابتداء سے اس کے آخری مرحلہ تک یہ عمل جاری رہتا ہے۔ صبر کا عمل بھی اسی طرح جاری رہنا ضروری ہے۔

(5) جس طرح وقت کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بانٹا جا سکتا ہے' انہیں علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح تربیت بھی مرحلہ واری ہوتی ہے۔ یکدم تربیت پوری کی پوری نہیں دی جا سکتی۔ اور ہر مرحلہ پر صبر کا اطلاق ضروری ہے۔

(6) جس طرح وقت کا معیارِ حرکت ایک ہی ہے اسی طرح تربیت کا ایک مقررہ معیار رسول اللہ صلعم اور تابع تام رسول اللہ صلعم کی دعوۃِ بصیرت کے تحت ہے۔

یہاں تک تو ''وقت'' اور ''انسان'' کے مختلف امور' ان کا عمل اور ردِ عمل' نقصان کی نوعیت اور وجہ پھر اس کے مداوہ کیلئے مجوزہ علاج پر تفصیل' حسب توفیق وادراک بتائے گئے ہیں۔ اس سورۃ کو دیکھ کر ہی سمجھ میں آتا ہے کہ ''سمندر'' کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔

حضرت امام فخر الدین رازیؒ کا قول ہے کہ ''میں نے سورۃ ''والعصر'' کا مطلب برف بیچنے والے سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ ''رحم کرو اس شخص پر جس کا سرمایہ گھلا جا رہا ہے'' اس کی بات سن کر میں نے کہا یہ ''والعصر ان الانسان لفی خسر' یعنی زمانہ کی قسم' بے شک انسان ضرور خسارہ میں ہے' کی بات ہے۔ یعنی عمر کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے وہ برف کے گھلنے کی طرح تیزی سے گزر رہی ہے۔ اس کو اگر ضائع کیا جائے یا غلط کاموں میں صرف کر ڈالا جائے تو انسان کا خسارہ ہی ہے۔''

بادی النظر میں یہ بات ہر طرح صحیح ہے۔ چنانچہ ہر تفسیر میں یہی نظریہ ملے گا کہ عمل کی غفلت سے خسارہ ہوتا ہے۔ یعنی ''ہونے والے نقصان'' کی بات بتائی جاتی ہے۔ لیکن سورۃ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ انسان'' پہلے ہی سے'' نقصان میں ہے۔ یعنی نقصان کا واقعہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اسی لئے کہا جارہا ہے کہ'' بے شک انسان خسارہ میں ہے'' یہ خسارہ جیسا کہ پہلے ہی بتایا جاچکا ہے' حضرت آدم علیہ السلام پر ہو چکا۔ حضرت کی ایک غفلت سے ان کا تنزل زمین پر ہو گیا۔ اور اسی وجہ سے حضرت قرب الٰہی اور دیدارِ الٰہی سے محروم ہو گئے۔ یہی تو سب سے بڑا خسارہ تھا۔ یہی خسارہ آدمؑ سے اولادِ آدمؑ کو وراثت میں ملا۔ اسی لئے کہا جارہا ہے'' بے شک انسان خسارہ میں ہے۔''

تمام تفاسیر میں صرف ہونے والے خسارہ کی بات کی گئی ہے اور اس خسارہ کی روک تھام کے لئے ایمان اور عمل صالح کا نسخہ بتایا گیا ہے۔ یہ نہیں سمجھ میں آیا کہ اس خسارہ سے اوپر بھی ایک خسارہ ہے جو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اس کا ذکر اس مضمون کے صفحہ ۲۱ میں کیا گیا ہے۔ اسی خسارہ کے مداوہ کے لئے ایمان' عمل صالح' حق کی وصیت اور صبر کی تلقین کی شرط رکھی گئی ہے۔ ان شرائط کو پورا کئے بغیر انسان کا خسارہ نہ صرف قائم رہے گا بلکہ اور بڑھ جائے گا کیونکہ یہ غفلت منشاءِ ایزدی کے خلاف ہے۔ اس ساری تفصیل کی اصل ''منشاءِ الٰہی'' ہے۔

منشاءِ الٰہی:

حدیث قدسی ہے۔'' اَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرِفُ'' (میں چاہتا ہوں کہ جانا جاؤں' پہچانا جاؤں) اسی سے منشاء الٰہی مضمر ہے۔ اس منشاء کے تحت جاننے والا اور پہچاننے والا چاہئے۔ لہٰذا تخلیقِ انسان اور تخلیق کائنات اسی منشاءِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔ اللہ کے اس منشاء کے مطابق انسان سے یہ توقع رکھی گئی ہے کہ وہ اللہ کو جانے اور پہچانے۔ جاننے کی توقع پوری کرنے کے لئے اللہ نے کائنات میں اپنی تخلیق اور حکمت کی نشانیاں رکھ دی ہیں جن سے اللہ کی قدرت اور اس کے وجود کے ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی سے انسان جان سکتا ہے کہ اللہ کی ہستی کیا ہے۔ پہچاننے کی توقع پوری کرنے کے لئے اللہ نے انسان کو صلاحیتِ ادراک دی۔ اب انسان کا کام ہے کہ وہ اللہ کو جانے

اوراللہ کو مانے۔یہی ایمان ہے۔اسی بات کو جتانے کے لئے اللہ نے بار بار ہدایت بھیجی اور ہدایت بردار (پیغمبر) بھی۔انسان کو لازم ہوگیا کہ وہ ہدایت کو اور ہدایت بردار کو مانے کیونکہ یہی منشاءِ الٰہی کی تکمیل میں انسان کے مددگار ہیں۔

اللہ کا منشاء صرف ''جاننے'' سے تکمیل نہیں پاتا بلکہ ''پہچاننا'' بھی ضروری ہے کیونکہ اُعْرِفُ میں دونوں امور ہیں۔اس کے لئے ''عرفان'' کی صلاحیت چاہئے۔چونکہ اللہ نورالسموات والارض ہے اس لئے اس کو پہچاننے کے لئے نور ہی چاہئے۔اللہ نے انسان کے لئے اس کا انتظام بھی کر دیا ہے۔چنانچہ قرآن مجید میں سورہ کوثر میں کہا گیا ہے اِنَّا اَعْطینکَ الکوثَرo یعنی ہم نے تم کو کوثر عطا کیا ہے۔کوثر ہی وہ نور ولایت ہے جو انسان کو عطا کیا گیا ہے۔اس کا مکان انسان کے سینے میں ہے۔ جسے بلدالامین کہا گیا ہے۔یہی انسانی تقویم کی سب سے بڑی احسنیت ہے۔یوں سورہ کی یہ آیت کے خصوصی مخاطب رسول اللہ صلعم ہیں لیکن عمومی طور سے ہر انسان اس کا مخاطب ہے۔اس نعمت کی عطا کرنے کے بعد کہا گیا ہے فصَلِّ لِرَبِّکَ وَنْحَر یعنی صلواۃ قائم کرو اور قربانی دو۔ یہاں پر قربانی کسی جانور کی نہیں ہے بلکہ انسان اپنی خودی کی نفس کی قربانی دے۔یہ دونوں امور فرائضِ ولایت سے مضمر ہیں۔

پھر کہا جارہا ہے اِنّ شانِئَکَ ھُوَ الْابتَرُ یعنی بیشک تمہارا دشمن ابتر ہوجائے گا۔سب سے بڑا دشمن تو شیطان ہے جو دل میں وساوس ڈال کر گمراہ کرتا ہے۔فرائضِ ولایت کی تکمیل کرنے سے حق کو پہچاننے کے معاملہ میں شیطان گمراہ نہیں کرسکتا۔کوثر کی عطا کے بعد انسان پر لازم ہوگیا کہ اللہ کو پہچاننے کے منشاء کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔انسان کے پاس اللہ کی عطا کردہ سب سے عظیم نعمت یہی نورِ ولایت ہے۔

جب انسان کے پاس دولت کا ایک خزانہ ہو اور وہ اس کو استعمال کئے بغیر یوں ہی رکھ چھوڑ دے تو ایسا فعل نقصان کا سبب بن جاتا ہے۔ کیونکہ عدم استعمال سے وہ اس فائدے یا نفع سے محروم ہوجاتا ہے جو اُسے استعمال کرنے سے ملتا۔اللہ کی عطا نور ولایت کا بھی ایسا ہی معاملہ

ہے۔ اگراس کے فیض کے حصول سے محروم رہیں تو بڑا خسارہ ہے۔ کیونکہ اللہ کی منشاء کی تکمیل نہیں کر پائیں گے۔ آدم سے لے کر تمام انسانوں کو اللہ کی یہ عطا ہے اور ہر دور میں اس کے استعمال کی تعلیم کسی نہ کسی طریقہ سے نبیوں، رسولوں اور مامور من اللہ ہستیوں کے ذریعہ دی گئی۔ جس نے عمل کیا حصولِ مقصد میں کامیاب ہوا۔ جس نے عمل نہیں کیا وہ خسارہ میں رہا۔

سورہ یوسف کی آیت ۱۰۸ میں رسول اللہ ﷺ کو اور تابع تام رسول اللہ صلعم مہدی علیہ السلام کو بصیرت کی دعوت دینے پر مامور کیا گیا۔ یعنی پہچاننے کی منشاءِ الٰہی کی تکمیل کے لئے انسانوں کی تعلیم و تربیت پر دونوں ہستیوں کو مامور کیا گیا۔ جس نے عمل کیا با کمال ہو گیا یعنی صاحبِ بصیرت ہو گیا۔ جس نے عمل نہیں کیا وہ عظیم ترین خسارہ میں رہ گیا۔

سورۃ والعصر کے دو اور مضمرات:

(1) سلسلۃ الذہب کی حدیث کے تحت وسطِ زمانہ میں مہدیؑ کا ظہور ہونا طئے تھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضرت سید محمد جونپوری مہدی موعود علیہ السلام مامور من اللہ ہو چکے اور آ چکے۔ یعنی حدیث کے تحت وسط زمانہ ہو چکا اب زمانہ اپنے ''وقتِ عصر'' کی طرف بڑھ چکا جو اور آگے بڑھ کر غروب ہو جائے گا۔ لہٰذا فی زمانہ والعصر کے تحت یہ بتایا جا رہا ہے کہ مہدیؑ پر ایمان اور فرائض ولایت کے ساتھ حق کی وصیت اور صبر تحمل اور استقلال پر عمل کریں ورنہ یقیناً انسان خسارہ میں رہے گا۔

(2) سورہ تکاثر:۔ ترجمہ تم لوگوں کو دنیا کی حرص نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک لب گور پہنچ جاتے ہو۔ ایسا ہرگز مت کرو۔ عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا پھر سے سن لو ایسا مت کرو۔ اگر تم یقینی علم رکھتے تو انجام کو جانتے۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ یقین کرو تم ضرور دیکھ لو گے۔ پھر اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔

یہاں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ عمر کے ''عصر'' سے گزر کر غروب کی جانب چل پڑے ہو اور ابھی بھی دنیا کی حرص میں اتنے کھو گئے ہو کہ انجام سے بے بہرہ ہو گئے ہو۔ بہت جلد معلوم ہو جائے گا اور اُس دن نعمتوں کا حساب لیا جائے گا۔ لہٰذا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جو سب سے عظیم نعمت

''نور ولایت'' عطا کی گئی تھی اس سے استفادہ کئے بغیر یوں ہی رکھ چھوڑا۔اس کا بھی حساب لیا جائے گا۔کتنا بڑا خسارہ ہے سمجھنا چاہئے۔

اس سورۃ والعصر سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دیدارِ الٰہی' ذکرِ خفی وذکرِ دوام اور بعثتِ مہدیؑ اور اس کے متعلق تمام امور کے تعلق سے ہم مہدویوں کا جو موقف ہے وہ بالکل صحیح اور قرآنی بنیادوں پر ہے۔

آخر میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مضمون ناچیز نے ۱۹۹۵ء میں لکھا تھا اس کے لے مجھے حضرت سید فضل اللہ صاحب حافظ تشریف اللّٰہی قبلہؒ اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے لکچر سے' جو انہوں نے ایک یونیورسٹی کے Convocation جلسہ میں دیا۔اور پورا لکچر ''والعصر'' کی بنیاد پر رکھا تھا۔ان ہی دونوں کے بیان سے مجھے اسی سورۃ پر ایک نئے زاویہ سے سوچنے کی ترغیب ملی۔ بعد میں اسی سورۃ پر ایک اور کتاب بنام ''انسان اور خسران'' جو حضرت مولانا سید محمد سرفراز مہدی تشریف اللّٰہی صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے تحریر کیا ہے' دیکھنے میں آئی۔اس کتاب میں بہت تفصیل سے حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ضرور پڑھنے کے قابل ہے۔

فقط تمام ہوا یہ بیان۔بفضلہٖ تعالیٰ رسول اللہؐ کے صدقے سے' مہدیؑ کے صدقے سے اور اپنے مرشد کے طفیل سے' آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اپنے فضل وکرم سے رسول اللہ صلعم کے صدقے سے' مہدیؑ کے صدقے سے' ایمان' نیک توفیق اور اچھی عقل سے نوازے۔حقیقت کی روشنی اور حقیقت کا علم دے۔آمین

فقط

احقر۔سید مسعود مصطفیٰ

☆☆☆☆